سہ ماہی

دبیر

فارسی ادب کا ترجمان..........

شمارہ : اول

اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۴ء

از

دبیر حسن میموریل لائبریری، کاکوری، لکھنؤ

ISSN:- 2394-5567

صوفیاء کی زمین کاکوری سے فارسی ادب کا ترجمان............

دبـــیـــر

(سہ ماہی ریفریڈ ادبی جریدہ)

جلد:۔اول
اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۴ء
شمارہ:اول
زرتعاون:۱۰۰روپئے

مدیر:۔ احمد نوید یاسر ازلان حیدر

از:۔ دبیر حسن میموریل لائبریری ، کاکوری، لکھنؤ

مــجــلــس مـشـا ورت

۱۔ پروفیسر مسعود انور علوی، شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

۲۔ پروفیسر محمد مظہر آصف، شعبۂ فارسی، گوہاٹی یونیورسٹی، آسام

۳۔ پروفیسر عزیز بانو، صدر شعبۂ فارسی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدر آباد۔

۴۔ احمد علی، کیپر (مینسکرٹ)، سالار جنگ میوزیم، حیدر آباد، تلنگانہ۔

۵۔ ڈاکٹر شاہد نوخیز اعظمی، شعبۂ فارسی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدر آباد۔

۶۔ ڈاکٹر محمد شعائر اللہ خاں وجیہی قادری رامپوری، خانقاہ احمدیہ، مسٹن گنج، رامپور۔

۷۔ ڈاکٹر عابد حسین، صدر شعبۂ فارسی، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ۔

۸۔ ڈاکٹر اخلاق احمد، شعبۂ فارسی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی۔

۹۔ ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین ربانی، اے ایس آئی، ناگپور۔

۱۰۔ ڈاکٹر سیدہ عصمت جہان، شعبۂ فارسی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدر آباد۔

۱۱۔ ڈاکٹر رضوان اللہ آروی، شعبۂ فارسی، ایچ ڈی جین کالج، آرہ، بھوج پور۔

۱۲۔ ڈاکٹر افتخار احمد، شعبۂ فارسی، مولانا آزاد کالج، کلکتہ۔

۱۳۔ سید عادل احمد، محکمہ آثار قدیمہ، آندھرا پردیش اسٹیٹ میوزیم، پبلک گارڈن، حیدر آباد۔

۱۴۔ ڈاکٹر محمد قیصر، شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

اعلان

دبیر حسن میموریل لائبریری کے سہ ماہی ادبی جریدہ ''دبیر'' کی ہی طرح انشاء اللہ ہمارا سالنامہ ''کوکب ناہید'' بھی شائع ہوگا، جس کے لئے معزز اساتذۂ کرام وطلباء فارسی سے درخواست ہے کہ اپنے پر ارزش مقالات سے ہماری معاونت فرمائیں۔ یہ سالنامہ ''فارسی تذکرہ نویسی'' اور ''فارسی مثنوی نگاری'' پر محیط ہوگا۔

مصنفین سے درخواست ہے کہ اگر وہ اپنی تصانیف پر جو کہ فارسی ادب سے متعلق ہوں تبصرہ شائع کروانا چاہیں تو ہماری لائبریری کے پتے پر اپنی تصنیف کی دو کاپیاں ارسال کرنے کی زحمت کریں۔

آپ کے تعاون کا شکریہ! مدیر

ISSN:- 2394-5567

صوفیاء کی زمین کاکوری سے فارسی ادب کا ترجمان......

سہ ماہی ادبی جریدہ۔ **دبیر**

☆ جلد۔۱ ☆ شمارہ۔۱ ☆ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۴ء

زرتعاون:۔فی شمارہ:۱۰۰ روپئے،سالانہ:۴۰۰ روپئے

☆سرپرست☆

پروفیسر عمر کمال الدین کاکوروی

صدر شعبۂ فارسی،لکھنؤ یونیورسٹی،لکھنؤ

☆نگران اعلی☆

ڈاکٹر سید محمد اصغر عابدی

شعبۂ فارسی،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ

☆نگراں☆

ڈاکٹر انجمن صدیقی (لکھنؤ)

☆ایڈیٹر☆

احمد نوید یاسر ازلان حیدر

ریسرچ اسکالر،شعبۂ فارسی،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،علیگڑھ

Mob. no. 09410478973

☆مراسلت کا پتہ☆

دبیر حسن میموریل لائبریری

۱۲۔چودھری محلّہ (جنوبی)،کاکوری،لکھنؤ۔۲۲۶۱۰۱

dabeerpersian@rediffmail.com

☆ مقالہ نگاروں سے گزارش ہے کہ اپنے مقالے اردو ان پیج کی فائل میں ہمارے برقی پتے پر ارسال کریں۔

☆مجلس ادارت☆

پروفیسر سید حسن عباس

شعبۂ فارسی، بنارس ہندو یونیورسٹی، بنارس

پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید

شعبۂ فارسی،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ

ڈاکٹر علیم اشرف خان

شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی، دہلی

ڈاکٹر مظہر عالم صدیقی

شعبۂ فارسی، اسماعیل یوسف کالج، جوگیشوری، ممبئ

ڈاکٹر محمد عقیل

شعبۂ فارسی، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی

محمد قمر عالم

شعبۂ فارسی،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ

☆ریویو کمیٹی☆

پروفیسر آذرمی دخت صفوی

ڈائرکٹر، مرکز تحقیقات فارسی، اے ایم یو،علی گڑھ

پروفیسر عبدالقادر جعفری

صدر شعبۂ عربی و فارسی، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

پروفیسر شمیم اختر

صدر شعبۂ فارسی، بنارس ہندو یونیورسٹی، بنارس

پروفیسر عراق رضا زیدی

صدر شعبۂ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

پروفیسر طاہرہ وحید عباسی

صدر شعبۂ فارسی، برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال

☆معاون مدیران☆

نقی عباس کیفی، جے این یو۔دہلی، **محمد توصیف خان کاکر**۔اے ایم یو،علی گڑھ، **ارمان احمد**۔بی ایچ یو، بنارس، **محمد جعفر**۔جے این یو، دہلی۔**مناظر حق**، اے ایم یو،علی گڑھ، **عاطفہ جمال**،لکھنؤ

فہرست

اداریہ
مدیر ۴

عہد اورنگ زیب کا تاریخی پس منظر
ڈاکٹر سید محمد اصغر عابدی ۵

روہیل کھنڈ کے ایک مہاجر صوفی اور ان کی تصانیف
پروفیسر عمر کمال الدین کاکوروی ۱۹

دکنی شاعری کی ماہ تمام۔ چندا بائی لقا
ڈاکٹر شاہد نوخیز اعظمی ۲۷

مولانا جلال الدین رومیؒ
ڈاکٹر محمد قمر عالم ۳۶

علامہ اقبال کی شخصیت وفن پر مضامین

اقبال کی فارسی شاعری
سعدالدین ۴۱

علامہ اقبال
مناظر حق ۴۴

اقبال کا تصور عشق
نشاط فاطمہ ۴۷

اداریہ

دنیا میں جتنے بھی مذاہب ہیں ان میں سے ہر ایک کا نام یا تو کسی خاص شخص کے نام پر رکھا گیا ہے یا اس قوم کے نام پر جس میں مذہب پیدا ہوا مثلاً عیسائیت کا نام اس لئے عیسائیت ہے کہ اس کی نسبت عیسیٰؑ کی ہے۔ بودھ مت کا نام اس لئے بودھ مت ہے کیونکہ اس کے بانی مہا تما بدھ تھے۔ زرتشتی مذہبت کا نام اپنے بانی زرتشت کے نام پر ہے۔ یہودی مذہب ایک خاص قبیلہ میں پیدا ہوا جس کا نام یہوداہ تھا۔ ایسا ہی حال دوسرے مذاہب کے ناموں کا بھی ہے۔ مگر اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی شخص یا قوم کی طرف منسوب نہیں ہے بلکہ اس کا نام ایک خاص صفت کو ظاہر کرتا ہے جو لفظ اسلام کے معنی میں پائی جاتی ہے۔ یہ نام خود ظاہر کرتا ہے کہ یہ کسی ایک شخص کی ایجاد نہیں نہ کسی ایک قوم کے ساتھ مخصوص ہے اس کو شخص یا ملک یا قوم سے کوئی علاقہ نہیں۔ صرف اسلام کی صفت لوگوں میں پیدا کرنا اس کا مقصد ہے ہر زمانہ اور ہر قوم کے جن سچے اور نیک لوگوں میں یہ صفت پائی گئی ہے وہ سب مسلم تھے۔ اور آئیندہ بھی ہوں گے۔

اسلام شاید واحد ایسا مذہب ہے جس مذہب میں تعیم حاصل کرنے کو بھی عبادت کا حصہ قرار دیا گیا ہے، حضور اقدس ﷺ سے مروی ہے کہ اگر لوگوں تمہیں اگر علم حاصل کرنے کے لئے چین تک بھی جانا پڑے تو جاؤ۔ یہاں چین تک جانے سے یہ مراد نہیں کہ چین ہی جاؤ بلکہ علم کے لئے جتنی بھی دشواریاں جتنی بھی مشقتیں اور جتنے بھی مصائب برداشت کرنا پڑیں کرو مگر علم حاصل کرو۔ علم انسان کو انسان بناتا ہے۔ علم کے ذریعہ ہی انسان اللہ رب العزت کی حقیقت کو سمجھ سکتا ہے۔ علم ہی ایک واحد ایک ذریعہ ہے جس کے ذریعہ انسان گدائی میں بھی شاہی کی خصوصیات اپنے اندر پیدا کرسکتا ہے۔

ہندوستان جہاں پہلے آریوں، پھر مسلمانوں پھر انگریزوں نے حکومت کی اور اب دوبارہ سے یہاں کی حکومت ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں یہاں کی تعلیم گاہوں میں بیشمار زبانیں اور ادب پڑھائیں جاتے ہیں ہر زبان و ادب کا ایک خاص امتیاز و اہمیت ہے۔ انہی میں سے ایک فارسی زبان و ادب ہے جو اب زیادہ تر یونیورسٹیوں میں ہی پڑھایا جاتا ہے چونکہ عام ہندوستانیوں کی جو فارسی ادب سے جڑے ہوئے ہیں زبان اردو ہے اور ہندوستان میں اردو زبان میں فارسی ادب کا کوئی ترجمان رسالہ نظر سے نہیں گذرتا جو صرف فارسی ادب کے لئے مخصوص ہو لہٰذا میں نے اس کام کو شروع کیا ہے بقیہ آپ سے دعا کی درخواست ہے۔

یاسر

عہد اورنگ زیب کا تاریخی پس منظر

ڈاکٹر سید محمد اصغر عابدی
شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اس مقالہ میں عہد اورنگ زیب کا تاریخی خاکہ کھینچنے کی کوشش کی ہے، ہندوستان کی تاریخ کے مطابق ۱۶۵۸ء سے لے کر ۱۷۰۷ء کا زمانہ عہد عالمگیری کہلاتا ہے۔ ابوالمظفر محی الدین اورنگ زیب ۲۴، اکتوبر ۱۶۱۸ء کی رات کو شاہجہاں کی محبوب بیگم ممتاز محل کے بطن سے پیدا ہوا۔ یہ شاہجہاں کا تیسرا بیٹا تھا جبکہ دارا اور شجاع اورنگ زیب کے دو بڑے بھائی تھے۔ شاہی رسم کے مطابق نومولود کے والد شاہزادہ خرم نے شہنشاہ وقت جہانگیر کو ایک ہزار اشرفیاں بطور نذرانہ پیش کیں۔ جہانگیر اپنے تیسرے پوتے کی تولد کی خبر سن کر بہت خوش ہوا۔ اور اس کا نام محی الدین محمد اورنگ زیب رکھا۔

اورنگ زیب کی پیدائش کے موقع پر ابتدائی رسوم بڑے شان وشوکت سے ادا کی گئیں اور اس کے بعد شاہی قافلہ اجین پہونچا جہاں اورنگ زیب کی ولادت کی خوشی پر ایک عظیم الشان جشن منایا گیا۔ اورنگ زیب کی تاریخ پیدائش کے بارے میں مورخوں اور تذکرہ نویسوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بہرحال تذکرہ نگاروں نے ''توزک جہانگیری'' کے حوالے سے ۱۶۱۸ء مطابق ۱۰۲۷ھ کو ہی اورنگ زیب کی ولادت کا صحیح سال تسلیم کیا ہے۔ جب اورنگ زیب کی عمر صرف چار ہی سال ہوئی تھی کہ شاہزادہ خرم (شاہجہاں) نے اپنی ماں نور جہاں سے اختلاف کی وجہ سے شہنشاہ وقت جہانگیر کے خلاف بغاوت کر دی لہٰذا اس بغاوت اور سرکشی کی وجہ سے ۱۶۲۳ء میں شاہجہاں اپنے اہل وعیال سمیت دکن، اڑیسہ، بہار اور بنگال میں مارا مارا پھرنے لگا شاہی فوج سے کئی مرتبہ سامنا ہوا مگر ہر بار ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ آخر کار اسے باپ کے قدموں میں جھکنا پڑا اور علم بغاوت سرنگوں کر دیا تب جہانگیر نے مشروط طور پر شاہجہاں کی معافی قبول کر لی اور شفقت پدری کی بدولت بالا گھاٹ کی نظامت کے ساتھ دھتا اس اور اسیر گڑھ کے دو شاہی قلعے بھی اس کو عطا کئے۔ لیکن داراشکوہ اور اورنگ زیب کو بطور ضمانت جہانگیر نے اپنے پاس لاہور میں رکھا۔ جبکہ شاہزادہ شجاع پہلے ہی سے جہانگیر کے پاس لاہور ہی میں تھا۔ اس وقت اورنگ زیب تقریباً آٹھ سال کا ہو چکا تھا۔ شہنشاہ وقت جہانگیر ۱۶۲۷ء میں وفات پا گیا۔ اور شاہزادہ خرم شہاب الدین محمد ''شاہجہاں'' کے لقب سے ہندوستان کا بادشاہ بنا۔ تینوں بیٹوں کو لاہور سے اکبرآباد لے آیا۔ چنانچہ ممتاز محل (ارجمند بانو بیگم) فرط محبت میں اکبرآباد سے سکندرے جا کر تینوں بیٹوں سے ملیں۔ اس طرح دوسرے روز شاہزادوں نے بادشاہ کے حضور میں نذریں پیش کیں۔ اپنے دربار میں شاہزادوں کو دیکھ کر شاہجہاں نہایت خوش ہوا اور الفت پدری میں شاہزادوں کو گلے سے لگا لیا۔ اس کے علاوہ شاہزادوں کی آمد پر پورے دربار میں بڑے جوش وخروش سے خوشیاں منائی گئیں۔ اس موقع پر شاہزادہ اورنگ زیب کو ایک لاکھ روپیہ نقد اور پانچ سو روپیہ روزانہ وظیفہ مقرر ہوا۔ اس وقت اورنگ زیب کی عمر دس سال ہو چکی تھی۔ اس طرح سے شاہجہاں اپنی شاہزادگی کے ایام میں پریشانیوں کی وجہ سے شاہزادوں کی ابتدائی تعلیم وتربیت پر پوری طرح توجہ نہ دے سکا۔ لہٰذا جب تخت نشین ہوا اور اطمینان کی سانس لی تو اس کے بعد اس نے اپنے بیٹوں کی تعلیم وتربیت کی طرف دھیان دیا اور بالخصوص اورنگ زیب کی باقاعدہ تعلیم وتربیت کا سلسلہ شروع کروا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اورنگ زیب نے مختلف علماء وقت سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس نے اپنی مصروفیتوں کے باوجود بھی اکتساب علم کا سلسلہ جاری رکھا کیونکہ اورنگ زیب اوائل عمری ہی سے کافی ذہین تھا۔ شجاعت، دریا دلی اور ذرہ

نوازی بچپن ہی سے اورنگ زیب کے بنیادی رکن تھے۔ چنانچہ جب اورنگ زیب کی عمر چودہ سال کی تھی تو اورنگ زیب نے بڑی جرأت اور مردانگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک غضبناک ہاتھی کو مار ڈالا۔ اس طرح شاہجہاں شاہزادہ کی بہادری پر بہت خوش ہوا اور اس سلسلے میں پایۂ تخت میں کئی روز تک جشن منایا گیا۔ شاہزادہ کو سونے سے تولا گیا اسکے علاوہ ایک لاکھ اشرفیاں بطور انعام بھی عطا کی گئیں۔ دس ہزاری ذات اور چار ہزاری سوار منصب عطا ہوا علاوہ ازیں علم اور نقارہ بھی عطا ہوا۔ دارا اور شجاع کی طرح سرخ خیمہ لگانے کی بھی اجازت ہوئی ان تمام کارناموں کی بدولت شاہجہاں حقیقت میں خاموش دلی سے اورنگ زیب پر خاص نظر محبت رکھنے لگا اور اس کے ہر قول و فعل کو پسند کرنے لگا۔

اسی سلسلہ میں جب شاہجہاں ۱۶۳۴ء میں کشمیر گیا تو اس سفر میں اورنگ زیب بھی اس کے ساتھ تھا لہٰذا سفر کشمیر اور حقیقی قربت کی وجہ سے اسی دوران اورنگ زیب پر اور بھی عنایات ہوئیں جس کے نتیجہ میں کچھ جاگیر بھی عطا ہوئی تا کہ شاہزادہ اپنی مرضی کے مطابق عمارات بنا سکے۔

اورنگ زیب کی عمر جب اٹھارہ سال کے قریب ہوئی تو بندیل کھنڈ کے راجہ جھنجھار سنگھ جس نے ایک لمبے عرصہ سے باغیانہ رویہ اختیار کیا ہوا تھا اس کی سرکوبی کے لئے اورنگ زیب کو باقاعدہ مہم سپرد کی گئی۔ اس موقع پر شاہزادہ کی حوصلہ افزائی اور دلجوئی کے لئے خاص منصب میں اضافہ کیا گیا۔ کیونکہ شاہجہاں شاہزادے پر بڑی ذمہ داری سونپنے سے پہلے اورنگ زیب کو تجرباتی مہم پر روانہ کرنا چاہتا تھا۔ اورنگ زیب متواتر دو سال تک اس مہم پر سرگرم عمل رہا۔ کئی تجربات حاصل کئے دشوار اور سنگلاخ پہاڑیوں میں چلنا سیکھا اسی دوران بہت ہی خون ریز لڑائیاں بھی لڑی گئیں جس میں اورنگ زیب فوجوں کا سربراہ رہا اور فوج کو لڑنے کے ڈھب بھی سکھائے۔ اس طرح بندیل کھنڈ کی مہم سے اورنگ زیب سرخ رو ہوا تو ۲۹، اپریل ۱۶۳۶ء میں اورنگ زیب کو دکن کی نظامت سپرد کی گئی۔ تو اورنگ زیب نے بڑی ہوشیاری اور ذمہ داری کا ثبوت دیتے ہوئے آٹھ سال نظامت کی۔ اور ان آٹھ سالوں میں اس کے خلاف پورے صوبے سے کسی قسم کی شکایت شہنشاہ وقت شاہجہاں تک نہ پہونچی۔ دکن ان دنوں میں بذات خود ایک مملکت تھی کیونکہ اس وقت مغلیہ سلطنت چار بڑے صوبوں میں تقسیم تھی۔ پہلا صوبہ دولت آباد تھا اورنگ زیب کا صدر مقام اسی صوبے میں تھا۔ دوسرا صوبہ بالا گھاٹ یا تلنگانہ تھا اور تلنگانہ ہی اس کا صدر مقام تھا۔ تیسرا صوبہ خاندیش تھا اور برہان پور اس کا اہم صدر مقام تھا جبکہ چوتھا صوبہ بالترتیب برار تھا۔ برار کا صدر مقام ایلچی پور تھا اس کے علاوہ کاویل برابر کا نہایت مشہور قلعہ تھا۔ ان چار صوبوں میں ۶۴ قلعے تھے جن میں ۳۵ قلعے پہاڑوں پر تھے۔

جب اورنگ زیب نے دکن کی صوبیداری سنبھالی تو اس وقت صوبے کے حالات بری طرح سے بگڑ چکے تھے ان بگڑے ہوئے حالات کو سدھارنے کے لئے اورنگ زیب برابر سرگرم عمل رہا، اور اس عرصہ میں اورنگ زیب چار مرتبہ دہلی آیا۔ پہلی بار ۱۶، اپریل ۱۶۳۷ء کو اپنی شادی کے موقع پر، دوسری مرتبہ ۳۰، دسمبر ۱۶۳۹ء کو برائے ملاقات عزیزاں۔ تیسری بار ۱۱، مارچ ۱۶۴۲ء کو برائے ملاقات پدر و مادر اور عزیزاں جبکہ چوتھی بار ۲ مئی ۱۶۴۴ء میں جہاں آراء بیگم کی عیادت کے لئے آیا۔

اورنگ زیب کی شادی شاہ نواز خاں صفوی کی بیٹی دلرس بیگم سے ۱۶، اپریل ۱۶۳۷ء کو ہوئی جبکہ اس سے قبل اس کے دو بڑے بھائی دارا شکوہ اور شجاع کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ ان دونوں شاہزادوں کی شادیوں پر جو اخراجات ہوئے اس کی ذمہ داری شاہزادوں کی بہن جہاں آراء بیگم کے سر تھی، جبکہ اورنگ زیب کی شادی کے تمام اخراجات اور ذمہ داریاں خود شہنشاہ وقت شاہجہاں نے ادا کی تھیں یہ

اورنگ زیب کی پہلی شادی تھی۔ لہٰذا اس موقع پر بہت بڑا جشن منایا گیا۔ دارا، شجاع اور جہاں آرا بیگم اس شادی کے منتظم تھے۔ دلرس بیگم کو اورنگ زیب کے حرم میں ''محل خاص'' کی حیثیت حاصل تھی۔ رالعتہ الدورانی کے نام سے مشہور ہوئی جبکہ دلرس بیگم کی وفات اورنگ زیب کے تخت نشین ہونے سے پہلے ہی ہوگئی تھی۔ اس سے اورنگ زیب کے پانچ اولادیں تھیں جن کے نام اس طرح ہیں زیب النساء، زینت النساء، زبدۃ النساء محمد اعظم اور اکبر اسکے علاوہ اورنگ زیب نے کچھ اور شادیاں بھی کی تھیں۔ ان میں سے ایک نواب بائی تھی جس کا اصل نام رحمت النساء تھا یہ کشمیر کی ریاست راجوری کے راجہ راجو کی بیٹی تھی، جس سے اورنگ زیب کی تین اولادیں تھیں۔ محمد سلطان، محمد معظم اور بدر النساء۔ اس کے علاوہ اورنگ آبادی محل، اودے پوری محل، زین آبادی محل، دل آرام اور دولت آبادی محل بھی اورنگ زیب کے عقد میں تھیں، اورنگ آبادی محل سے مہر النساء اور اودے پوری محل سے کام بخش پیدا ہوا تھا۔

شاہجہاں کی تخت نشینی کی سترہویں سالگرہ کے موقعے پر یعنی ۲۶، مارچ ۱۶۴۴ء کو اورنگ زیب بھی دکن سے آیا اور بڑے پر خلوص جوش و جذبہ سے باپ کے جلوس تخت نشینی میں شرکت کی۔ مگر اورنگ زیب کو آگرہ سے آئے ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ دشمنوں نے اپنی الٹی چالیں چلنا شروع کر دیں اور شاہجہاں کے کان بھر دئے۔ جس کی وجہ سے شاہجہاں اورنگ زیب سے سخت ناراض ہو گیا۔ اور دکن کی صوبیداری سے دست بردار کر دیا اس طرح اس کے دشمن اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے اس موقعے پر شاہجہاں کافی پریشان ہوا، لیکن ابھی اس بات کو صرف سات ہی مہینے گزرے تھے کہ اورنگ زیب کی ہمشیرہ جہاں آرا بیگم اپنے والد کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اپنے بھائی کی طرف سے معذرت خواہ ہو کر اس کی معافی کی سفارش کی۔ شاہجہاں اپنی بیٹی کی سفارش قبول کرتے ہوئے اورنگ زیب سے پھر راضی ہو گیا اس کی غلطی معاف کر دی گئی۔ اورنگ زیب پر جو جو پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں پوری طرح سے اٹھا لی گئیں۔ شاہی لباس سے نوازا گیا اور منصب بھی عطا کئے۔ لیکن پھر بھی دکن کی نظامت اس کو دوبارہ نہ مل سکی بلکہ اورنگ زیب کو ۱۶ فروری ۱۶۴۵ء میں نظامت گجرات پر فائز کیا گیا۔ گجرات ہندوستان کا ذرخیز صوبہ تھا۔ تجارت اور صنعت کے لئے نہایت ہی مشہور تھا، کاٹھیاواڑ اور سومنات جیسے اہم اور مشہور مقامات بھی اسی صوبے میں واقع تھے۔ جس وقت اورنگ زیب کو اس علاقے کی سربراہی ملی تو اس وقت یہاں کے حالات کافی بگڑے ہوئے تھے لوٹ مار، غارت گری، چوری اور عیاری کا بازار گرم تھا۔ اورنگ زیب کو حالات درست کرنے میں بڑی دقتیں پیش آئیں، مگر عالمگیر نے اپنی ذہانت، سنجیدگی اور جرأت سے بگڑے ہوئے حالات درست کر لئے اور پورے صوبے میں امن و امان قائم کر دیا۔

ابھی گجرات میں صرف دو ہی سال گزرے تھے کہ شاہجہاں کا حکم پہونچا کہ اورنگ زیب مالوہ کے حاکم شائستہ خاں کو گجرات کی نظامت سپرد کر کے فوراً لاہور پہونچے تا کہ اس کو بلخ اور بدخشان کی مہم سپرد کی جائے۔ بلخ اور بدخشان میں اس وقت مراد بخش پچاس ہزار سرکاری فوج کی قیادت کر رہا تھا مگر اس کو علاقہ پسند نہیں تھا۔ جس کی وجہ سے بری طرح سے شکست کھائی۔ وہ شاہجہاں کی جازت کے بغیر ہ آگرہ لوٹ آیا اور شاہجہاں کو اپنا منشا بتا دیا جبکہ بلخ اور بخارا کو اپنی مملکت میں شامل کرنے کے لئے ابتداء سے ہی مغل بادشاہ لڑتے رہے، لہٰذا شاہجہاں کے عہد حکومت میں اس پرانے خواب کی تعبیر کا کافی اچھا موقع تھا اور اس کے لئے حالات بھی کافی سازگار تھے چنانچہ ۱۰ فروری ۱۶۴۷ء کو اورنگ زیب بدخشاں کی مہم کے لئے روانہ ہو گیا۔

اورنگ زیب تقریباً ۲۵ ہزار فوجیوں کے ساتھ پشاور پہونچا اور پھر کابل سے ہوتا ہوا آگے بڑھا۔ ۱۷، اپریل ۱۶۴۷ء میں

ازبکوں کو شکست دی اور ۲۵ مئی ۱۶۴۷ء کو بلخ پہونچا۔ اورنگ زیب جارحانہ جنگ کا عادی تھا لہٰذا اس وقت اورنگ زیب نے نہایت دانشوری اور ثابت قدمی کا ثبوت دیا اورنگ زیب اسی طرح لڑتا ہوا واپس آ رہا تھا کہ نماز ظہر کا وقت آ گیا۔ دشمن کا ہر طرف سے خطرہ تھا امراء کے منع کرنے کے باوجود بھی اورنگ زیب نہایت اطمینان اور دلیری سے گھوڑے سے اترا اور میدان جنگ میں باجماعت نماز ادا کی۔ (جون ۱۶۴۷ء) بدخشاں میں اس وقت عبدالعزیز کا دور دورہ تھا جب اس نے یہ واقعہ سنا تو پکار اٹھا ''با چنین کسی در افتادن بر افتادن است''۔

سینٹرل ایشیا کی مہموں کا نتیجہ خواہ جو کچھ بھی ہوا لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ اورنگ زیب نے اپنی جنگی صلاحیت مضبوط کر لی کیونکہ اس نے نئے نئے جنگی تجربات کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے فوجیوں کا خاطر خواہ خیال رکھا، جس کی وجہ سے اورنگ زیب بہت جلد لوگوں میں ہر دل عزیز ہو گیا امراء وقت اور منصب دار اس کی قیادت پر فخر کرتے تھے۔

بلخ اور بدخشاں کی واپسی کے بعد اورنگ زیب کو ۱۵ مارچ ۱۶۴۸ء میں ملتان کا گورنر مقرر کیا گیا، ابھی ملتان میں چین کی سانس نہ لی تھی کہ قندھار کا تنازعہ شروع ہو گیا۔ تو شاہجہاں نے اورنگ زیب کو حکم بھجوایا کہ سعد اللہ خاں کو ساتھ لے کر قندھار کی مہم پر روانہ ہو جائے۔ چنانچہ اورنگ زیب ملتان سے اور سعد اللہ خاں لاہور سے ۲۲ جنوری ۱۶۴۹ء میں قندھار کی پہلی مہم کے لئے روانہ ہوئے۔ مگر ان دونوں کے پہونچنے سے پہلے ایرانیوں نے قندھار پر قبضہ کر لیا لیکن دونوں جرنلوں نے اپنی پیش قدمی جاری رکھی اور قندھار پہنچ کر اس کا محاصرہ کر لیا لیکن کامیابی نہ ملنے کی وجہ سے ۸ دسمبر ۱۶۴۹ء میں محاصرہ اٹھا لیا گیا اورنگ زیب واپس ملتان چلا آیا۔ تقریباً دو سال کے بعد یعنی ۱۶ فروری ۱۶۵۲ء میں شاہجہاں کے حکم سے دوبارہ اورنگ زیب کو قندھار کی دوسری مہم پر جانا پڑا۔ اورنگ زیب نے جاتے ہی علاقے کا محاصرہ کر لیا تقریباً تین مہینے تک یہ محاصرہ جاری رہا اسی دوران شہنشاہ شاہجہاں نے مہم میں ۲ مئی ۱۶۵۲ء کو بذات خود مداخلت کی۔ ایرانیوں کے مقابلے میں مغلوں کے پاس وسائل کم تھے ان کا توپ خانہ کمزور پڑ رہا تھا۔ بہر حال مئی ۱۶۵۲ء میں محاصرہ پھر سے اٹھا لیا۔ اگر چہ اورنگ زیب چاہتا تھا کہ اسے ایک بار پھر محاصرے کی اجازت ملے مگر اسی بیچ شاہجہاں اورنگ زیب سے ناراض ہو گیا اور ادھر داراشکوہ برابر شاہجہاں کو اس کے خلاف ورغلاتا اور بھڑکاتا رہتا رہا۔

اس طرح سے قندھار کی تیسری مہم ۱۶۵۳ء میں داراشکوہ کے سپرد کی گئی۔ داراشکوہ نے متواتر کئی مہینے تک کوشش جاری رکھی مگر وہ بری طرح سے ناکام رہا، ادھر دوسری طرف اورنگ زیب کو قندھار کی مہم کے بعد ملتان اور سندھ دونوں جگہوں کا گورنر مقرر کیا گیا۔ اورنگ زیب جتنے وقت تک ان صوبوں میں رہا وہاں اصلاح وفلاح کا کام کرتا رہا لیکن اس دوران اورنگ زیب کو مرکز کی طرف سے کوئی خاص مدد نہ ملی۔ دوسری طرف داراشکوہ، شاہجہاں اور اورنگ زیب کے درمیان مخالفت کو روز بروز ہوا دیتا رہا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہجہاں نے اورنگ زیب کو بڑے سخت خطوط لکھے مگر اورنگ زیب نے ادب واحترام کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس کا جواب دیا۔ ادھر یہ کشمکش چل رہی تھی کہ جولائی ۱۶۵۳ء میں اورنگ زیب کو شاہجہاں کی طرف سے دکن کی مہم پر جانے کا حکم ملا۔ اس وقت اورنگ زیب ملتان میں تھا چنانچہ باپ کا حکم مانا اور ۱۷، اگست ۱۶۵۳ء میں دکن کا رخ کیا۔ اس سفر میں اورنگ زیب کو کئی اہم واقعات پیش آئے پہلے یہ کہ اورنگ زیب کی شجاع سے آگرہ میں ملاقات ہوئی اور آئندہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے دونوں بھائیوں کے درمیان دوستی کا معاہدہ ہوا۔ دوسرے یہ کہ اورنگ زیب کے بیٹے محمد سلطان کی شجاع کی لڑکی سے نسبت قرار پائی۔ تیسرے یہ کہ جب اورنگ

زیب آگے بڑھا تو برہان پور میں اپنے خالو سیف الدین کے ہاں فروکش ہوا۔اس قیام کے درمیان ہیرابائی جو بعد میں زین آبادی محل کے نام سے مشہور ہوئی اس سے اورنگ زیب کی شادی ہوئی۔

پچھلے دس سالوں سے دکن کی حالت بہت ابتر ہو گئی تھی نظم وضبط پوری طرح ختم ہو چکا تھا۔زبوں حالی اور خشک سالی کی بدولت لوگ پریشان ہو گئے تھے وادیاں جو پہلے سرسبز وشاداب تھیں پوری طرح سے ویران ہو گئی تھیں۔فوج کی حالت کچھ بہتر نہ تھی بیجاپور اور گولکنڈہ کی دونوں ریاستیں خراج ادا کرنے میں لاپرواہی برتنے لگی تھیں چنانچہ شاہجہاں نے اورنگ زیب کو دکن روانہ کرنے سے پہلے وہاں کے حالات سے بخوبی واقف کروادیا تھا اسکے علاوہ حاکم بیجاپور کی نافرمانی کے پورے واقعات بتادئے تھے تاکہ وہاں کی مہم سے بھرپور فائدہ اٹھایا جائے۔جب اورنگ زیب دکن پہنچا تو اس نے پہلے وہاں کے حالات کا بخوبی جائزہ لیا اور پھر بعد میں حملہ کیا۔دکن کو اپنے قبضہ میں لیکر گولکنڈہ اور بیجاپور کی ریاستوں پر فتح پانے کے لئے مشغول ہوا۔اس طرح ۲۲ دسمبر ۱۶۵۵ء میں شاہجہاں کے حکم سے اورنگ زیب نے ریاست گولکنڈہ کے خلاف جنگ کا اعلان کیا۔اورنگ زیب نے اپنے لڑکے محمد سلطان کے ساتھ گولکنڈہ کا محاصرہ کرلیا اس کی فوجوں نے اپنے تمام جوہر دکھائے جب یہ لڑائی بالکل فتح کے نزدیک پہنچ چکی تھی کہ داراشکوہ کی رقیبانہ کوششوں نے شاہجہاں کو مجبور کر دیا تھا کہ گولکنڈہ کی فتح سے اورنگ زیب کو روک دے۔اب اس طرح بادشاہ کے حکم سے اورنگ زیب نے اپنی فوجیں پوری طرح ہٹالیں اور مارچ ۱۶۵۶ء میں اورنگ زیب کو مجبوراً ایک صلح نامہ پر دستخط کرنے پڑے۔گولکنڈہ کی مہم کے بعد اورنگ زیب نے مارچ ۱۶۵۶ء میں بیجاپور کی طرف اپنا رخ کیا،بیجاپور پر بھی اس نے بڑی حوصلہ مندی اور بہادری سے حملہ کیا اورنگ زیب جب فتح سے بالکل قریب تھا اور اس نے تھوڑے ہی عرصہ میں بیدر اور کلیانی کے دو مشہور قلعے اپنی آہنی گرفت میں لے لئے تھے تو شاہجہاں نے عادل شاہیوں سے ڈیڑھ کروڑ روپیہ بطور تاوان لے کر ان سے صلح کر لی۔ادھر اورنگ زیب ان دونوں ریاستوں کا پوری طرح مسئلہ حل کرنا چاہتا تھا مگر داراشکوہ کی ناپاک اور رقیبانہ سازشوں کی وجہ سے دکنی ریاستوں کا الحاق نہ ہوسکا۔

اس طرح ابھی گولکنڈہ اور بیجاپور دونوں ریاستوں کی کشمکش برابر جاری تھی۔کہ ٦ دسمبر ۱۶۵۷ء میں بادشاہ وقت شاہجہاں اچانک بیمار ہو گیا جب شاہزادوں نے باپ کے بیمار ہونے کی خبر سنی تو چاروں بیٹے داراشکوہ،شجاع،اورنگ زیب اور مراد بخش حصول اقتدار کے لئے آپس میں لڑنے لگے۔دراصل جنگ تخت نشینی میں اصلی مقابلہ دو بھائیوں داراشکوہ اور اورنگ زیب میں تھا جبکہ شجاع اور مراد کا حصول اقتدار میں کوئی خاص مقام واضح نہ تھا مگر دوسری طرف داراشکوہ اور اورنگ زیب دونوں الگ الگ جماعتوں کی سرپرستی کرتے تھے۔داراشکوہ وسیع الخیال لوگوں کا سربراہ تھا جبکہ اورنگ زیب تنگ نظر مسلمانوں کی رہبری کررہا تھا۔تنگ نظر اور سخت خیال والے علماء وامراء داراشکوہ کے خلاف تھے اور وہ اورنگ زیب کی حمایت اس لئے کررہے تھے کہ انہیں یہ اندیشہ ہونے لگا تھا کہ اگر حکومت داراشکوہ کو ملی تو اکبری دور کی طرح لوگ بہت آزاد ہو جائیں گے اور ان لوگوں کے خلاف ہو کر انہیں سرکشی کا موقع مل جائے گا۔

ادھر شاہجہاں کی بیماری کی خبر سارے ملک میں پھیل گئی اور اس کے ساتھ یہ افواہ بھی پھیل گئی کہ شاہجہاں کا انتقال ہو گیا ہے۔یہ بات اس لئے پھیلی تھی کہ داراشکوہ نے باپ کی بیماری کی خبر خفیہ رکھنے کی کوشش کی تھی جس کی وجہ سے داراشکوہ نے ولی عہد ہونے کا دعویٰ کیا اور حکومت کے تمام کاموں کو اپنے ہاتھوں میں لینے کی کوشش کی۔کیونکہ اس کا واحد مقصد اورنگ زیب کی بڑھتی ہوئی طاقت کو کم کرنا تھا اسی لئے شاہی فوج اور اعلیٰ منصب دار جہاں کہیں بھی تھے تمام کو واپس دربار میں بلایا گیا اور بھائیوں کے خلاف جنگ

کرنے کا منصوبہ تیار کرنے لگا۔ اس کے علاوہ اورنگ زیب، شجاع اور مراد بخش کے تمام درباری وکیلوں کو نظر بند کر دیا اور ان کے گھروں پر چھاپے مارے گئے۔ جبکہ اس وقت اورنگ زیب، شجاع اور مراد بخش تینوں شاہزادے بالترتیب دکن، بنگال اور گجرات کے صوبیدار تھے چنانچہ دارا نے گجرات، بنگال اور دکن کو جانے والے تمام راستوں پر پہرے لگا دئے اور تمام آمد و رفت کی سہولتیں منقطع کر دیں۔ اس کے علاوہ داراشکوہ نے مراد بخش اور اورنگ زیب کے درمیان میں تفرقہ ڈالنے کی کوشش کی۔ برار کا علاقہ جو اس وقت اورنگ زیب کی مملکت میں شامل تھا اس کو مراد بخش کو دینے کی پیش کش کی۔ علاوہ ازیں قاسم خاں اور جودھ پور کے راجہ جسونت سنگھ کو شاہی فوج دے کر مالوے کی طرف روانہ کیا لہٰذا اس بڑھتی ہوئی کشمکش اور رقیبانہ کاروائیوں کی بدولت بھائیوں کے شبہات پوری طرح یقین میں بدل گئے اور اسی عمل کو مدنظر رکھتے ہوئے مراد بخش اور شجاع دونوں شاہزادوں نے فوراً عمل ظاہر کیا۔ چنانچہ شجاع نے بمقام راج محل ''ابولفوز ناصرلادین محمد'' تیمور ثانی' سکندر ثانی اور شاہ غازی کا لقب اختیار کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور ۲۵ جنوری ۱۶۵۸ء میں دارا کے خلاوت بغاوت کر دی اور اس سے جنگ کرنے کے لئے آگرہ کی طرف روانہ ہوا۔ جبکہ دوسری طرف شاہی فوج کی سرپرستی سلمان شکوہ اور وجے سنگھ کر رہے تھے۔ شجاع جب بنارس پہنچا اور لڑنے کے لئے آگے بڑھا ہی تھا کہ ۱۶ فروری ۱۶۵۸ء میں برہان پور کے مقام پر شاہی فوج کے ہاتھوں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

چنانچہ دوسری طرف مراد بخش وقت کا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا اس نے سورت کی بندرگاہ پر حملہ کر دیا اور لوٹ مار مچا دی مراد بخش ۱۶۵۸ء میں بمقام احمد آباد ''مروج الدین'' کا لقب اختیار کر کے اپنی حکومت کا اعلان کیا اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے نام کا سکہ بھی جاری کیا۔ دارا کو نہایت تلخ الفاظ میں خط لکھا اور لڑنے کی تیاری شروع کر دی۔ اس عمل کے لئے فوجی طاقت قابل قبول نہ تھی۔ اس طرح مراد نے اورنگ زیب کو خط لکھا اور اس سے امداد اور اتحاد کی درخواست کی۔

اس ہنگامی صورت حال سے نپٹنے کے لئے اورنگ زیب کئی ہفتے پریشان رہا کیونکہ باپ کے انتقال کی خبر پر اسے یقین نہ تھا اور اس کے ساتھ اورنگ یہ بھی چاہتا تھا کہ شہنشاہ وقت شاہجہاں دارا کی بڑھتی ہوئی سازشوں کا انتقام لے۔ مگر اورنگ زیب کی یہ خواہش ہرگز پوری نہ ہوئی اور شاہجہاں نے اس بات پر بالکل غور نہیں کیا۔ ادھر دوسری جانب شاہی فوج دارا کی سرپرستی میں مالوا پہنچ گئی تھی۔ ان کا ارادہ تھا کہ پہلے مراد بخش کی سرزنش کی جائے پھر اطمینان سے دکن میں اورنگ زیب کی خبر لی جائے۔ لہٰذا اس موقعے سے نپٹنے کے لئے اورنگ زیب نے مراد کی درخواست کو قبول کر لیا اور لڑنے کے لئے فوج روانہ کی۔ اس کے علاوہ یہ عہد نامہ بھی لکھ کر بھیجا کہ اگر وہ آخر تک اتحاد کا ثبوت دیتا رہا تو کامیابی کے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔ یعنی کابل، کشمیر، شمالی پنجاب اور سندھ کے صوبے اس کو دے دئے جائیں گے۔ مختصر یہ کہ اورنگ زیب نے اپنی فوج کو شمالی سرحدوں کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا گویا یہ اورنگ زیب کی طرف سے داراشکوہ کے لئے اعلانیہ جنگ تھی۔ اورنگ زیب کی فوج نے ۳، اپریل ۱۶۵۸ء میں دریا نربدا کو عبور کیا اور آہستہ آہستہ اپنی جنگی منازل طے کرتے ہوئے ۱۲، اپریل ۱۶۵۸ء کو مالوے کے مقام پر مراد بخش کی فوج سے مل گیا۔ اور ۱۲، اپریل ہی کو شاہی فوج کے سپہ سالار قاسم خاں اور جسونت سنگھ کو پیغام بھیجا کہ ہم لڑنا نہیں چاہتے، اسلئے ہمارا راستہ چھوڑ دو کیونکہ ہمیں صرف پایۂ تخت تک جانا ہے مگر شاہی فوج کے کمانڈروں نے بالکل نہ مانا ۔ اور سپیری ندی پر پہرا بٹھا دیا جس کی خاص وجہ یہی تھی کہ اورنگ زیب اور مراد کی فوج کو ندی سے پار نہ جانے دیں۔ تو اس وقت اورنگ زیب نے بندھیلہ قبیلے کے سرداروں کی مدد سے کافی دوری کی منزل طے کرتے ہوئے بڑی

جانفشانی سے دریا کو عبور کیا۔ ۱۵، اپریل ۱۶۵۸ء کو دونوں فوجوں کے درمیان ''دھرمٹ'' کے مقام پر بڑی خونریز جنگ ہوئی۔ اس لڑائی میں اورنگ زیب اور مراد بخش کی مکمل فتح ہوئی جبکہ شاہی فوج کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اور شاہی فوج کے سپہ سالار قاسم خاں اور جسونت سنگھ نے بھاگ کر اپنی جان بچائی۔ اورنگ زیب نے اس فتح عظیم کی یاد میں بڑی دھوم دھام سے جشن منایا اور دھرمٹ کے مقام پر ایک قصبہ بسایا جو بعد میں فتح آباد کے نام سے مشہور ہوا۔

اس طرح دھرمٹ کی فتح کا چرچا عام ہوا اور خبریں تمام ملک میں پھیل گئیں اس واقعے کو سن کر شاہجہاں دہلی جاتے جاتے رک گیا کیونکہ شاہجہاں چاہتا تھا کہ بغیر کسی خون خرابے کے شہزادوں کے درمیان صلح کروا دی جائے مگر اورنگ زیب نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ پیغام بھیجا کہ جب تک بادشاہ وقت داراشکوہ کی ناپاک سازشوں سے باز نہیں آتے تب تک وہ کسی قسم کے شاہی حکم کو تسلیم نہیں کریں گے۔

الغرض ادھر داراشکوہ، اورنگ زیب کی فتح اور بڑھتی ہوئی عزت اور طاقت سے نہایت پریشان تھا مگر دوسری طرف وہ کسی قسم کی مصالحت نہیں چاہتا تھا۔ اس عمل پر شاہجہاں بڑا مجبور تھا کیونکہ وہ داراشکوہ کی مرضی کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جبکہ داراشکوہ ایک لاکھ فوج لے کر حریفوں کی خبر لینے کو آگے بڑھا۔ دارا کو اپنے جنگی وسائل پر پورا عبور تھا اور اس کو مکمل یقین تھا کہ ایک ہی حملے میں دشمنوں کو کچل ڈالیں گے۔ اسی اثناء میں مراد بخش اور اورنگ زیب کی فوج نے مئی کے مہینے کی شدت کی دھوپ میں دریا چنبل کو پار کیا۔ دوسری طرف شاہی فوج نے آگرہ سے صرف چند میل کی مسافت طے کی تھی کہ ۲۹ مئی ۱۶۵۸ء میں بمقام ساموگڑھ دونوں فوجوں کے درمیان زبردست لڑائی ہوئی۔ اس لڑائی میں بھی اورنگ زیب کی کامیابی اور داراشکوہ کو شکست ہوئی۔

اورنگ زیب فتح کے نقارے بجاتا ہوا آگرہ کی طرف روانہ ہوا وہاں پہنچتے ہی اس نے شاہجہاں کو فوراً آگرہ کے قلعے میں نظر بند کر دیا۔ اس کے بعد اورنگ زیب فوراً دہلی روانہ ہو گیا۔ اس طرح جنگ تخت نشینی کو مدنظر رکھتے ہوئے شیخ عبدالوہاب نے فتویٰ جاری کیا کہ شاہجہاں چونکہ بیمار اور ضعیف ہونے کی وجہ سے امور سلطنت سنبھالنے سے بالکل معزور ہیں لہٰذا اورنگ زیب نے جو بھی لشکرکشی کی وہ شرعاً جائز ہے۔ اس طرح بیشتر امراء وعلماء خاص علاقہ (قصور) کے پٹھانوں نے بھی اورنگ زیب کی کھلم کھلا حمایت اور مدد کی۔

داراشکوہ ایک شکست خوردہ فوجی کے مانند مالوے سے آگرہ آیا، شرمندگی کے مارے باپ کو بھی منہ نہ دکھا سکا۔ شب کی تاریکی میں چھپتا ہوا قیمتی جواہرات اور اپنی بیوی بچوں کو لے کر پہلے دہلی پہنچا اور پھر دہلی سے ہوتے ہوئے پنجاب پہنچا کیونکہ سرزمین پنجاب اس کی خاص مملکت تھی۔ اور اسے یہاں سے مدد ملنے کی پوری پوری امید تھی۔ اس کے علاوہ داراشکوہ کو یہ بھی بھروسہ تھا کہ اس کا بڑا بیٹا سلمان شکوہ جو پہلے مرزا شجاع کی فوج کو شکست دے چکا تھا اس کی حمایت بھی اس کو مل جائے گی۔

ادھر اورنگ زیب کو عوام مبارک بادی اور نذریں پیش کر رہی تھی اس موقع پر خود شاہجہاں نے تبریک وتحسین کے پیغام بھیجے اور اس کے علاوہ ایک شاندار تلوار بھی پیش کی۔ اسی دوران جہاں آرا بیگم اورنگ زیب سے ملنے آئی، اور بادشاہت کو چار بھائیوں میں تقسیم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اورنگ زیب اس کی بات پر بالکل رضامند ہو گیا اور جہاں آرا بیگم کو قلعے میں داخل ہونے اور باپ سے ملنے کی اجازت بھی دے دی۔ اورنگ زیب اسی امر کو مدنظر رکھتے ہوئے دہلی سے آگرہ جانے کے لئے تیار تھا مگر اتنے میں دربار کا مخصوص اہل کار ناصر دل خاں آیا۔ اس کے ہاتھ میں داراشکوہ کے نام شاہجہاں کا لکھا خط تھا۔ اتفاقاً یہ خط اورنگ زیب کے ہاتھ لگ

گیا۔ جس میں لکھا تھا، ''داراشکوہ ابھی تم اپنے مقام پر ٹھہرو میں اس مہم کا فیصلہ تیرے نام کر دیتا ہوں''۔ جب یہ سازش اورنگ زیب پر عیاں ہوگئیں تو اس نے ہر صلح صفائی اور فیصلے کو ماننے سے انکار کر دیا پھر وہ داراشکوہ کے تعاقب کے لئے نکلنے ہی والا تھا کہ مراد بخش کی طرف سے طرح طرح کی باتیں پیدا ہونے لگیں اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ ایک طرف وہ باپ کو خفیہ خط لکھ رہا تھا تو دوسری جانب اورنگ زیب کے امراء کو لالچ دے کر اپنی طرف مائل کرنا چاہتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اورنگ زیب کو وہ وعدے جتلانے لگا جو جنگ سے پہلے دونوں بھائیوں کے درمیان طے ہوئے تھے۔ جبکہ اورنگ زیب نے اس کو بار بار منع کیا کہ ابھی امن قائم ہونے دو میں اپنے تمام وعدے پورے کروں گا (۱)۔ لیکن مراد بخش کو سمجھانے اور راضی کرنے کے لئے اورنگ زیب کی باتوں کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا آخر کار مجبوراً اورنگ زیب نے اسے گرفتار کر لیا۔ مراد بخش کو پہلے سلیم گڑھ اور پھر گوالیار کے قلعہ میں بھیج دیا گیا کچھ عرصہ وہاں پر مقید رہا مگر بعد میں علی قلی شاہی دیوان کے قتل کے الزام میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس طرح اورنگ زیب نے پہلی تخت نشینی کی رسم بڑی شان و شوکت سے ۲۱ جولائی ۱۶۵۸ء میں دہلی کے قریب ''باغ اغوآباد'' جو بعد میں شالیمار باغ کے نام سے مشہور ہوا اسی میں ادا کی۔ اور ابوالمظفر محی الدین اورنگ زیب بادشاہ غازی کا لقب اختیار کر کے بروز جمعہ اپنی شہنشاہیت کا اعلان کیا۔

اب اورنگ زیب نے تھوڑی چین کی سانس لی اور اس کے بعد داراشکوہ کی خاطر پنجاب کی جانب روانہ ہوا مگر اس عرصہ میں داراشکوہ جگہ جگہ نقل مکانی کرتا رہا۔ وہ پنجاب سے لاہور، لاہور سے ملتان اور پھر ملتان سے ہوتا ہوا گجرات کی طرف بھاگنے میں کامیاب ہوا مگر اسی دوران اورنگ زیب کو خبر ملی کہ شاہ شجاع وقت کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی غرض سے دوبارہ صوبہ بنگال سے آگرہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اورنگ زیب ابھی پنجاب سے واپس ہی آیا تھا کہ کچھ دنوں کے بعد الہ آباد کے قریب شجاع کی فوج سے سامنا ہوا اور موضع ''خواجوہ'' کے میدان میں دونوں بھائیوں کے لشکر کے درمیان زبردست لڑائی ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شجاع کافی مقدار میں ساز و سامان میدان جنگ میں چھوڑ کر فرار ہوگیا۔ شجاع کی تلاش کے لئے اورنگ زیب نے اپنے بڑے بیٹے محمد سلطان اور میر جملہ کو مقرر کیا۔ شجاع نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا وہ بنگال سے نکل کر آسام پہنچا وہاں اس نے آسام کے راجہ کے یہاں پناہ لی ابھی تھوڑا ہی وقت بیتا تھا کہ یہاں پر بھی اس کی مخالفت اٹھ کھڑی ہوئی جب شجاع نے دیکھا کہ حالات قابو سے باہر ہوگئے ہیں تو وہ آسام سے بھی بھاگ نکلا اور آسام کے گھنے جنگلوں میں چل دیا اس کے بعد وہاں کے پہاڑی قبائلیوں کے ہاتھوں قتل کر دیا گیا۔

دوسری طرف داراشکوہ سندھ سے ہوتا ہوا گجرات پہنچا تو اس وقت گجرات کی نظامت و صوبیداری شاہنواز خاں کر رہا تھا۔ شاہنواز خاں اورنگ زیب کا سسر تھا یعنی اس کی بیٹی دلرس بانو بیگم کی شادی اورنگ زیب سے ہوئی تھی۔ مگر ان تمام باتوں کو دیکھتے ہوئے شاہنواز خاں نے دارا کی طرفداری کی اور اپنے داماد اورنگ زیب کی زبردست مخالفت کی۔ جبکہ جسونت سنگھ نے بھی راجپوتوں کی طرف سے مدد کی پیش کش کی اور اجمیر کی طرف بڑھنے کا ارادہ ظاہر کیا اس طرح داراشکوہ کی ہمت اور بھی بڑھ گئی اور وہ اجمیر کی طرف بڑھنے لگا۔

اس بات کی خبر جب اورنگ زیب کو ملی تو اس کو مجبوراً اجمیر کی جانب بڑھنا پڑا، اور وہ اپنے سفر کی منزلیں طے کرتا ہوا ۱۱ مارچ ۱۶۵۹ء میں اجمیر پہنچا۔ اور دونوں بھائیوں کی فوجوں کے درمیان زبردست لڑائی ہوئی اس لڑائی میں شاہنواز خاں صوبیدار گجرات بھی مارا گیا اس طرح اورنگ زیب واپس دہلی لوٹ آیا مگر اب داراشکوہ یہ چاہتا تھا کہ وہ سندھ سے ہوتا ایران چلا جائے اور شہنشاہ ہمایوں کی

طرح ایران کے حکمران سے مدد لے کر دوبارہ اپنے حقوق کی آزمائش کرے ابھی دارا اسی کوشش ہی میں تھا کہ ''بنوں'' کے قریب ایک بلوچ سردار ملک جیون نے اس کو پکڑ کر شاہی حکام کے سپرد کر دیا۔ ۲۳ جون ۱۶۵۹ء دارا کو دہلی لایا گیا اور لوگوں کے درمیان سر بازار کوچوں اور گلیوں میں پھرایا گیا۔ جبکہ ۱۹، اگست ۱۶۵۹ء میں علماء کرام نے کفر والحاد کی بنیاد پر داراشکوہ کے قتل کا فتویٰ جاری کیا۔ لہٰذا علماء کا فتویٰ اورنگ زیب نے قبول کیا اور شاہی حکم کے مطابق ۳۰، اگست ۱۶۵۹ء میں داراشکوہ کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔

اس طرح اورنگ زیب اپنے تمام حریفوں اور مخالفین سے نجات پانے میں کامیاب ہوا اور دوسری رسم تاج پوشی بھی بڑی شان وشوکت سے ادا کی اورنگ زیب نے ہندوستان پر تقریباً پچاس سال دو ماہ اور ستائس دن تک حکومت کی۔ اس پورے دور کو دو برابر حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے جبکہ یہ دونوں نصف پچیس پچیس سالوں پر مشتمل ہیں۔ پہلے پچیس سال اورنگ زیب نے شمالی ہندوستان میں اصلاحات نافذ کرنے اور بغاوتوں کو دبانے میں کئے جبکہ آخری پچیس سال دکن کے حالات درست کرنے میں گزارے۔ پہلا حصہ ۱۶۵۷ء سے لیکر ۱۶۸۱ء تک پھیلا ہوا ہے اور دوسرا نصف ۱۶۸۲ء سے شروع ہو کر ۱۷۰۷ء یعنی اورنگ زیب کی وفات پر ختم ہوتا ہے۔

دراین اثناء جب بھائیوں میں تخت نشینی کے لئے جنگ شروع ہوئی اور چاروں شاہزادے اپنے اپنے صوبے چھوڑ کر آگرہ اور دہلی میں رہے اسی عرصے میں ان کے دشمنوں کو پھلنے پھولنے اور اپنی جڑیں مضبوط کرنے کا پورا موقع ملا (۱)۔ البتہ اورنگ زیب جب تخت نشین ہوا تو اس نے اپنی حکمت عملی سے مکمل فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، لہٰذا اورنگ زیب نے ملک کے تمام اہم صوبوں میں اپنے ہوشیار اور عقلمند آدمی مقرر کئے۔ تو اس سلسلہ میں اورنگ زیب نے دکن کی صوبیداری شائستہ خاں کو سونپی جبکہ بنگال کی نظامت میر جملہ کے حوالے کی۔ میر جملہ کا تعلق بنیادی طور پر ایران سے تھا وہ ایک قابل سپہ سالار تھا اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک اعلیٰ درجہ کا تاجر بھی تھا۔ اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنیاد پر ترقی کر کے حاکم گولکنڈہ کے دربار میں رسائی حاصل کی اور پھر وہیں پر ہی گولکنڈہ کی مہم کے دوران عالمگیر سے اس کی ملاقات ہوئی تب میر جملہ مغلیہ دربار سے منسلک ہو گئے اور بعد میں وزارت عظمیٰ کے منصب تک پہنچ گئے۔ جب عالمگیر کی طرف سے ان کو نظامت بنگال عطا ہوئی تو اس نے بڑی ہمت اور دوراندیشی سے کام لیا اور سب سے پہلے وہ کوچ بہار کی طرف روانہ ہوئے کیونکہ وہاں کے راجہ نے شاہزادوں کی تخت نشینی کے وقت ان کے خلاف بغاوت کر دی تھی اور ہر طرف غارت گری کا بازار گرم کر دیا تھا اور خاص طور سے مشرقی اضلاع میں بے حد لوٹ مار اور ستم ظریفی مچا رکھی تھی۔ میر جملہ نے حاکم بنگال کی اچھی طرح سرکوبی کی اور چاروں طرف اپنی گرفت مضبوط کر لی سب سے پہلے اس نے کوچ بہار کے قلعے پر حملہ کر دیا اور کافی دن دونوں طرف سے زبردست مقابلہ ہونے کے بعد سرکش راجا کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اور اس نے اپنی تقصیر قبول کر لی اس کے بعد قاضی صادق جو اس وقت کا مشہور قاضیِ دربار تھا اس نے راجا کے مکان کی چھت پر چڑھ کر اذان دی جبکہ راجا خود فرار ہو گیا اور بھوٹان میں جا کر پناہ لی۔ اس طرح میر جملہ نے کوچ بہار کی فتح کے بعد اپنا رخ آسام کی طرف کیا وہ بہت جلد ہی وہاں کے بگڑے حالات کو سدھارنے میں کامیاب ہو گیا جبکہ انہی دنوں میں اپنی فوج کے ساتھ چین کی طرف روانہ ہوئے کیونکہ میر جملہ چاہتے تھے کہ وہ چین پر بھی اپنی فتح حاصل کرے لیکن موسم کی خرابی کی وجہ سے اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے۔

اس طرح میر جملہ اب واپس دکن کی طرف لوٹ رہا تھا کہ بمقام جہانگر (ڈھاکہ) ۱۳ مارچ ۱۶۶۳ء میں اس کی موت ہو گئی۔ اورنگ زیب اس کی موت سے نہایت غمزدہ ہوا۔

چنانچہ میر جملہ کی موت کے بعد شائستہ خاں کو عالمگیر نے بنگال کا گورنر مقرر کیا۔شائستہ خاں نے اپنی ذمہ داری بخوبی نبھائی اور تقریباً تیس سال بنگال کا گورنر رہا۔ بنگال میں اس زمانے میں ماگوں اور فرنگیوں نے بڑی لوٹ مار مچارکھی تھی لہٰذا اس بڑھتی ہوئی بدحالی کو مدنظر رکھتے ہوئے اورنگ زیب نے شائستہ خاں کو حکم جاری کیا کہ وہ ان غارتگروں اور رہزنوں کی پوری طرح سے بیخ کنی کریں اسلئے شائستہ خاں نے اپنے بیٹے کو مہم پر روانہ کیا۔اس کے وہاں پہنچتے ہی پرتگالی حلیفوں نے تو جلدی ہی ماگوں کا ساتھ چھوڑ دیا مگر دوسری طرف ''ارکان'' (جگہ کا نام) کا راجا اور دیگر فرنگی امراء ان کے ساتھ ہو گئے۔اس طرح یہ کشمکش کافی مدت تک چلتی رہی اور بالآخر چٹا گاؤں کا مضبوط قلعہ مسلمانوں کی گرفت میں آ گیا۔اور مکمل فتح حاصل کی اس موقع پر عالمگیر اپنے درباریوں پر بہت خوش ہوا جس کے نتیجے میں شائستہ خاں اور دیگر امراء کو داد دی اور اس کے ساتھ ساتھ انعام واکرام سے بھی نوازا اور شائستہ خاں ہفت ہزاری کا منصب بھی عطا ہوا۔

شائستہ خاں ایک تجربہ کار سپہ سالار اور سیاست داں تھا، یہ اورنگ زیب کا ماموں تھا اس نے بنگال کے حالات درست کرنے میں بڑی شائستگی اور حکمت عملی سے کام لیا۔الغرض شائستہ خاں کا عہد سپہ سالاری حکومت بنگال کے لئے خوش حالی کا دور تھا کیونکہ اسی زمانے میں وادی کشمیر کے سپہ سالار نے مشرقی سرحدوں کی طرف فوج کشی کی اور اپنی حکومت کو لداخ کی سرحدوں تک پہنچا دیا اور کشمیر کی بیرونی سرحدوں کو پہلے کے مقابلے میں کافی وسعت حاصل ہوئی۔

پنجاب اور کابل کے درمیان جنگجو قبائلی آباد تھے وہ اکثر عوام کو تنگ کرتے رہتے تھے اور شورشیں برپا کرتے تھے یہاں تک کہ عالمگیر کے زمانے میں بھی انہوں نے اپنی حرکتیں جاری رکھیں۔شمال مغرب میں خاص کر آفریدیوں اور یوسف زئیوں نے بے حد بدنظمی پیدا کر دی تھی۔یہ تمام حالات وواقعات اورنگ زیب کے لئے دردسر بنے ہوئے تھے جن کو وہ برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔اسلئے امین خاں کی سربراہی میں عالمگیر نے غارتگروں کو کچلنے کے لئے فوج روانہ کر دی اور خود اورنگ زیب نے حسن ابدال میں پڑاؤ ڈالا اور تقریباً ڈیڑھ سال وہاں پر ہی قیام کیا، چنانچہ وہاں جاتے ہی شاہی فوج نے اپنی گرفت مضبوط کر لی اور سرحدوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف چند مہینوں میں سرکشوں نے سزا پائی اور پھر اس علاقہ سے کبھی بھی کسی قسم کی کوئی شورش نہیں اٹھی اور نہ غارتگروں اور سرکشوں نے ملک کے حالات کو بگاڑنے کی کوئی کوشش کی۔

اسی دوران ملک میں کئی غیر مسلم تنظیمیں بھی اٹھ کھڑی ہوئیں جنہوں نے اپنے وقت کی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی جیسے متھرا کے ہندوؤں نے خراج کی ادائگی میں رکاوٹ ڈالنا شروع کر دی اور اس کے ساتھ ساتھ بہت سے باغی ہو گئے (۲)۔جب ان بدلتے ہوئے حالات اور واقعات سے عالمگیر آگاہ ہوا تو اس نے ہندوؤں کے خلاف لشکر کشی کر دی۔متھرا کے ہندوؤں کو بری طرح سے شکست ہوئی اور متھرا کا حاکم اس بغاوت میں مارا گیا۔اور ۱۶۷۰ء میں اورنگ زیب کو شاندار فتح حاصل ہوئی اس کے بعد تقریباً دو سال کا عرصہ امن وامان سے گذرا مگر ۱۶۷۲ء میں ست نامی اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے اورنگ زیب کی شاہی فوج کے خلاف اعلانیہ بغاوت کر دیا اور ۱۶۷۲ء میں انہوں نے شاہی فوج کو شکست دے دی لیکن بعد میں مرکزی فوج کی مدد سے اس بڑھتی ہوئی بغاوت کو کچل دیا گیا۔

اس کے علاوہ سکھ جو ابتداء میں سیاست سے بالکل کنارہ کش تھے انہوں نے بھی اپنے پانچویں گرو ارجن سنگھ کی قیادت میں

سیاست میں مداخلت کرنا شروع کر دی، یہ زمانہ شہنشاہ جہانگیر کا تھا اس نے گرو ارجن دیو سنگھ کو موت کے گھاٹ اتار دیا، مگر جب عالمگیر کی تخت نشینی ہوئی تو سکھوں کے ساتویں گرو ہر رائے نے داراشکوہ کی حمایت کی تھی مگر عالمگیر نے اس کی اس حرکت پر کوئی دھیان نہ دیا، اور گرو ہر رائے کو معاف کر دیا۔ اس کے بعد جب آٹھواں گرو ہرکشن انتخاب کے لئے کھڑا ہوا تو اس وقت بھی اورنگ زیب نے کوئی مداخلت نہ کی، البتہ جب سکھوں کا نواں گرو تیغ بہادر ۱۶۷۴ء میں گدی نشین ہوا تو اس نے باغیانہ رویہ اختیار کیا اور ساتھ ہی ساتھ کشمیر اور پنجاب میں لوٹ مار کی وارداتیں پیش آنے لگیں تو گرو تیغ بہادر کو ۱۶۷۵ء میں اورنگ زیب نے قتل کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سکھوں کے دسویں گرو گوبند سنگھ نے اپنے تمام پیروکاروں کو مغلیہ سلطنت کے خلاف بھڑکا دیا، جس کی وجہ سے سکھوں کی ایک جماعت ابھر کر سامنے آئی اور بعد میں اس کو خالصہ کا نام دے دیا اور اسی تنظیم نے بعد میں اورنگ زیب کے خلاف بغاوت کر دی۔ اورنگ زیب نے بغاوتوں کو کچلنے کے لئے لشکر کشی کی جس میں گرو گوبند سنگھ کے دولڑکے مارے گئے اور سکھوں کو بری طرح شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ گرو گوبند سنگھ کو قید کر لیا گیا مگر بہت جلدی مغلوں کی سرپرستی قبول کر لی اور اورنگ زیب کے حکم کے مطابق دکن چلا گیا اور کافی عرصہ وہاں پر ہی مقیم رہا۔

ادھر راجپوتوں سے مغلوں کے دوستانہ تعلقات عہد اکبری سے اچھے چلے آ رہے تھے اور یہی دوستی عالمگیر کے زمانہ تک برقرار رہی کیونکہ راجپوت اورنگ زیب کے عہد میں بھی اعلیٰ منصبوں پر فائز تھے جس کی شاندار مثال جودھ پور کے راجا جسونت سنگھ تھے جو عہد اورنگ زیب میں کابل کے گورنر تھے۔ انہوں نے کابل پر کافی عرصہ تک حکومت کی اور بعد میں کابل ہی میں ان کی موت ہوئی مگر ان کی موت کے بعد راجپوتوں میں اقتدار کے لئے جھگڑے شروع ہو گئے چنانچہ اسی عمل کو بنیاد بنا کر راجپوتوں نے اورنگ زیب کے خلاف بغاوت کر دی۔ لہٰذا اس بغاوت اور خون خرابے کو روکنے کے لئے عالمگیر نے شاہزادہ اکبر کو مقرر کیا اور سازش سے نپٹنے کے لئے کابل روانہ کر دیا۔ جب شاہزادہ کابل پہنچا تو اس نے وہاں اپنا رعب جما لیا جس کی وجہ سے راجپوتوں کی تمام حرکتیں بے کار ثابت ہوئیں راجپوتوں نے ہوشیاری اور سیاست سے کام لیتے ہوئے شاہزادے کو سبز باغ دکھائے اور شاہی تخت کی لالچ میں ڈال دیا اور خود راجپوتوں نے دکھانے کے لئے ظاہراً اس کی سربراہی قبول کر لی۔ اس طرح ۱۶۸۰ء میں شاہزادہ اکبر راجپوتوں کی چال سازی میں بری طرح پھنس گیا اور راجپوت اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئے۔ شاہزادے اکبر نے جنوری ۱۶۸۱ء میں اپنے باپ اورنگ زیب کے خلاف بغاوت کر دی تو اس موقع پر بھی عالمگیر نے شاہزادے کی بڑھتی ہوئی سازشوں سے بڑی ثابت قدمی اور دانائی سے کام لیا اور اپنے بیٹے کو راجپوتوں کے دام فریب سے آزاد کروالیا۔ جس کے نتیجے میں بغاوت زیادہ زور نہ پکڑ سکی۔

شاہزادہ محمد اکبر کو زبردست شکست ہوئی اور وہ میدان جنگ سے فرار ہو گیا اور پھر وہاں سے سنکھا جی مرہٹہ کے دربار میں پہنچا مگر وہاں بھی پناہ نہ مل پائی پھر وہ ایران چلا گیا اور وہاں پر اس کا انتقال ہو گیا۔ جب کہ اس کی فوج کے سپہ سالار درگا داس ٹھا کر اور رانا اودے پور بھاگ گئے مگر رانا نے اورنگ زیب سے معافی مانگ لی تب رانا کی ریاست پھر سے بحال کر دی گئی اور ۱۴ جون ۱۶۸۱ء میں اس کو پنج ہزاری منصب بھی عطا ہوا۔ اس کو معاف کرنے کی خاص وجہ یہ تھی کہ رانا کے تین بیٹے اورنگ زیب کی شاہی فوج کی طرف سے لڑ رہے تھے۔ اب اس طرح شمالی ہندوستان کے حالات قدرے درست ہو گئے اور عالمگیر کو دکن کے حالات پر غور کرنے کے لئے فرصت ملی۔

عالمگیر جب تک شمالی ہند کی بغاوتوں کو مٹاتا تب تک جنوبی ہند یعنی دکن میں مرہٹوں نے اپنی جڑیں بہت مضبوط کر لی تھیں، کیونکہ مرہٹے عرصہ دراز سے جس موقع کی تلاش میں تھے ان کو بالآخر وہی موقع مل گیا۔ اس وقت مرہٹوں کی سرپرستی شیواجی کر رہا تھا حقیقت میں مرہٹوں کا اہم مرکز ''راجپوتانا'' تھا اور اسی علاقہ میں انہوں نے اپنی حکومت کو مستحکم بنا لیا تھا۔ سب سے پہلے ملک عنبر نے مرہٹوں کو فوج میں ملازم رکھا ملک عنبر کی موت کے بعد اورنگ زیب نے کرناٹک کا کچھ علاقہ شاہ جی کو بطور جاگیر عطا کیا۔ لیکن اس کا بیٹا شیواجی (۱) شروع ہی سے سرکش ہو گیا تھا۔ اس نے مرہٹوں کی ایک اچھی تعداد اکٹھا کر لی تھی۔ اور اپنے قصبے کے آس پاس لوٹ مار مچا رکھی تھی۔ جب یہ خبر حاکم بیجاپور کو ملی تو اس نے شاہ جی کو قید کر لیا اس بات کا شیواجی کو بڑا صدمہ ہوا اور اس نے مجبوراً مغلیہ حکومت سے اپنے باپ کی رہائی کے لئے درخواست کی جو منظور ہو گئی اور شاہ جی کو آزاد کر دیا گیا۔ تب شیواجی نے عرصہ دراز تک کوئی سازش نہ کی مگر حقیقت تو یہ تھی کہ شیواجی اندر ہی اندر اپنی طاقت کو بڑھاتا اور قلعے بناتا رہا۔ اس سلسلہ سے اس نے ''پونا'' اور ''سوپا'' کے علاقوں میں چالیس قلعے تعمیر کروا لئے تھے اور اس طرح اس نے فوجی طاقت بے حد مظبوط کر لی تھی۔

جب اورنگ زیب کو اس بات کی اطلاع ملی تو اس نے شیواجی کے خلاف لشکر کشی کر دی جس کی قیادت امیر الامراء شائستہ خاں کر رہا تھا۔ لڑائی میں شیواجی کو ناکامی ہوئی اور شائستہ خاں کو فتح حاصل ہوئی شیواجی میدان جنگ سے بھاگنے میں کامیاب ہو گیا جبکہ شائستہ خاں نے سوپا اور پونا پر مکمل قبضہ کر لیا۔ شائستہ خاں نے پونا کو اپنا صدر مقام بنایا اور خود شیواجی کے تعمیر کردہ محل میں رہنے لگا۔ ادھر شیواجی گلی گلی کی خاک چھانتا ہوا دشوار گذار پہاڑیوں میں پناہ گزیں ہوا۔ مگر شیواجی کا دستور یہ تھا وہ ہفتہ ہفتہ یا ایک ماہ سے زیادہ ایک جگہ نہ ٹھہرتا تھا کیونکہ اس کو عالمگیر کا ڈر تھا۔

'' شیوا چناں منکوب و مغلوب گردیدہ بود کہ میان کوہ ہائے دشوار گذار ہر ہفتہ و ہر ماہ جائے بسرے برد۔''

چنانچہ شمال مغربی دکن میں رہ کر شیواجی نے اپنی سازشوں کا سلسلہ جاری رکھا جب اس کی فوجی طاقت مضبوط ہو گئی تو اس نے ریاست بیجاپور میں غارتگری کرنا شروع کر دی اور ہمت اتنی بڑھی کہ مغل علاقوں کو بھی تاراج کرنے لگا۔ اورنگ زیب نے پھر اس کے صدر مقام راج گڑھ پر چڑھائی کر دی اس جنگ میں بھی شیواجی کو شکست ہوئی۔ اس کے بعد اورنگ زیب نے شاہزادہ معظم کو دکن کا صوبے دار مقرر کیا۔ شہزادہ معظم نے پہنچتے ہی شیواجی کو گرفتار کیا مگر عالمگیر کے درباری راجہ جئے سنگھ کی سفارش پر اس کو معافی مل گئی۔ شہزادہ معظم کی طرف سے اس موقع پر شیواجی کو شاہی خلعت اور ایک مرصع تلوار بھی عطا کی گئی کیونکہ شیواجی نے تیئیس (۲۳) قلعوں کی کنجیاں راجہ جئے سنگھ اور دلیر خان کے سپرد کر دی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ سلطنت مغلیہ کی سرپرستی قبول کر لی تھی۔ جب شیواجی آگرہ پہنچ گیا تو اس کو پنج ہزاری منصب دار امراء کی جگہ نشست ملی تو وہ اس پہ راضی نہ ہوا کیونکہ اس کی مرضی اس سے زیادہ کی تھی۔ لہٰذا شیواجی نے ایک بار پھر اپنی عیاری سے کام لیا۔ پیٹ کے درد کے بہانے باہر نکلا اور بھاگنے میں کامیاب ہو گیا اور تقریباً دو سال بعد شیواجی نے اچانک سورت کی بندرگاہ پر حملہ کر دیا اور کافی مال و زر لوٹ کر ایک بار پھر سنگلاخ پہاڑیوں میں جا چھپا مگر اس بار اورنگ زیب نے دلیر خاں اور راجہ جے سنگھ کو شیواجی کی تلاش میں روانہ کیا۔ چند مہینوں کے اندر دونوں نے اپنی حکمت عملی کے ذریعے شیواجی کو زندہ پکڑ لیا لیکن اس موقعے پر بھی پہلے کی طرح شیواجی نے مغلوں کی اطاعت قبول کر لی اور اورنگ زیب کا فرمان بردار بن گیا۔ ادھر شاہ جی اور شیواجی دونوں کو جشن شاہی میں

شرکت کیلئے اورنگ زیب نے آگرہ بلایا مگر شیوا جی راستے ہی سے فرار ہوگیا۔اس کے بعد جتنا عرصہ زندہ رہا مغلوں کے خلاف سازشیں کرتا رہا۔ بالآخر ۱۶۷۰ء میں شیوا جی نے راہ فنا اختیار کی۔

شیوا جی کی موت کے بعد اس کے بیٹے سنبھا جی نے مرہٹوں کی سربراہی قبول کی مگر یہ اس اہل نہ تھا کہ مرہٹوں کی رہبری کرتا۔جس کا فائدہ اورنگ زیب نے پوری طرح اٹھایا اور دکنی ریاستوں سے مرہٹوں کا پوری طرح سفایا کر دیا۔''بقول علامہ شبلی مرہٹہ قوم کا اس وقت پوری طرح سے خاتمہ ہو چکا تھا گویا ان کا صرف نام ہی باقی تھا''۔

اس طرح مرہٹوں کی بیخ کنی اور سرکوبی کے بعد اورنگ زیب خود دکن کی طرف روانہ ہوا۔اس سلسلے میں سب سے پہلے عالمگیر اورنگ آباد پہنچا۔ کچھ وقت وہاں قیام کرنے اور علاقے کے حالات پرنظر ڈالنے کے بعد اس نے بیجاپور اور گولکنڈہ جیسی عظیم ریاستوں کی طرف اپنا رخ کیا۔عادل شاہیوں نے کافی جم کر لڑائی کی مگر جلد ہی قلعے کا محاصرہ ہوگیا اگر چہ انہوں نے مرہٹوں سے مدد لینے کی کوشش کی مگر عالمگیر کی مضبوط فوج نے ان کے تمام علاقوں کو مسمار کر دیا لہٰذا بیجاپور کا علاقہ بھی پوری طرح سے عالمگیر کے زیر اقتدار ہوگیا۔

بیجاپور کی فتح کے بعد اورنگ زیب نے گولکنڈہ کی خبر لی۔اس مہم میں شہنشاہ وقت عالمگیر کا بڑا لڑکا محمد معظم بھی شامل تھا۔اس علاقے میں اس وقت ابوالحسن حکمران تھا جو نااہل تھا۔اس کے دور حکومت میں تمام علاقے میں بدنظمی اور بدحالی پھیلی ہوئی تھی ان تمام بگڑے حالات کو دیکھتے ہوئے شاہزادہ معظم حیدرآباد میں داخل ہوگیا۔تو ابوالحسن نے گولکنڈہ کے قلعے میں پناہ لی چاروں طرف سے قلعے کا محاصرہ ہوگیا اور بہت دن تک یہ محاصرہ جاری رہا۔آخر کار ابوالحسن تنگ ہوا اور اورنگ زیب سے صلح کی پیش کش کی۔اورنگ زیب نے اس کی درخواست قبول کر لی مگر ابوالحسن نے اقتدار میں دوبارہ آنے کیلئے کوشش جاری رکھی اور پھر بغاوت کیلئے اٹھ کھڑا ہوا۔ان بگڑتے ہوئے حالات کو دیکھتے ہوئے عالمگیر نے ابوالحسن کو قلعے میں مقیّد کر لیا اور گولکنڈہ کے علاقے کو بھی اپنی مملکت دکن میں شامل کر لیا۔

اس طرح بیجاپور اور گولکنڈہ کی فتوحات کے بعد اب اورنگ زیب کا واحد مقصد مرہٹوں کی بچی ہوئی طاقت ختم کرنا تھا چنانچہ اس نے بڑے جارحانہ انداز میں مرہٹوں کے باقی بچے ہوئے قلعوں پر اچانک حملہ کر دیا۔مرہٹے اس حملے کی تاب نہ لا سکے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرہٹے بسنت گڑھ، ستارہ، پارلے گڑھ اور کھیلنہ جیسے مضبوط قلعوں پر بھی قابض نہ رہ سکے جس کی وجہ سے مرہٹوں کی بچی ہوئی طاقت پوری طرح سے ختم ہوگئی اور اورنگ زیب اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔

روھیل کھنڈ کے ایک مہاجر صوفی اور انکی متصوفانہ خدمات پر ایک نظر

پروفیسر عمر کمال الدین کاکوروی، شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

بے عنایات حق و خاصان حق گر ملک باشد سیہ ہستش ورق
ہر کہ خواہد ہم نشینی با خدا او نشیند در حضور اولیاء
چوں شوی دور از حضور اولیا در حقیقت گشتۂ دور از خدا
یک زمانہ صحبتے با اولیا بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا
گر تو سنگ خارۂ مر مر شوی
چوں بصاحب دل رسی گوہر شوی

جنت نشان ہندوستان کی خوش قسمتی اور اقبال مندی تھی کہ اس سرزمین پر حضرات صوفیاء کرام کی آمد اسلامی حکومت کی تاسیس سے قبل ہی ہو چکی تھی، ان نفوس قدسیہ نے تبلیغ وحدانیت، تحفظ شریعت، اتباع سنت، صفائے باطن، تزکیۂ قلب، تصفیہ نفس، نیز ریاضات و مجاہدات شاقہ سے تقرب الٰہی کی سعادت حاصل کی اور ترویج و اشاعت اسلام کے لئے اپنی تمام تر توانائیوں کو صرف کرتے ہوئے۔ ع۔
دل بدست آور کہ حج اکبر است

کو اصول زندگی بنا کر انسان دوستی، اخوت، مساوات، بردباری، حلیمی، سلامت روی، خلوص، محبت، صلح جوئی، قناعت، توکل، حفظ مراتب، وضع داری، حسن اخلاق، تواضع و انکسار جیسی اعلیٰ اقدار کے امین و محافظ رہے، چونکہ ان حضرات کی توجہات عالیہ کا مرکز صرف اور صرف عوام الناس تھے اس لئے انہوں نے خلق خدا کی فیض رسانی کے لئے رشد و ہدایت جیسے اہم فریضہ کے ساتھ ساتھ قرطاس وقلم سے بھی وابستگی رکھی اور ملک کے مختلف مقامات پر بولی جانے والی عوامی زبان کو جذبات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔

زیرنظر مقالہ میں اسی خطہ مردم خیز یعنی دارالسرور معروف بہ رام پور کے ایک عارف حق شناس کی حیات وتخلیقی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے جس کی نظر فیض اثر نے نہ جانے کتنوں کو خاک سے پاک بنا دیا، جس کی علم و عرفان آگہی اور حق شناسی کے بحر ناپیدا کنار کی موجوں نے صدہا بندگان خدا کو جام الست سے سرشار کیا، جس کی تبلیغی و اصلاحی کاوشوں سے نہ جانے کتنے گم کردۂ راہ جادۂ مستقیم پر گام زن ہو گئے وہ ذات والاصفات ہے واقف اسرار رموز خفی وجلی حضرت مولانا شاہ محمد ہدایت علی نقشبندی مجددی رام پوری ثم جے پوریؒ کی۔

شاہ صاحب موصوف کی ولادت ۱۲۷۷ھ۔۶۱/۱۸۶۰ء(۱) میں رام پور میں ہوئی والد محترم کا نام یوسف علی خاں تھا، علوم متعارفہ کی تحصیل رام پور کے معروف عالم دین و استاذ حضرت مولانا ارشاد حسین مجددیؒ سے حاصل کی، خاندانی روایت کے مطابق وہ پیدل حج کرنے کی نیت سے گھر سے نکل پڑے ان کی پہلی منزل جے پور تھی جہاں ان کی ہمشیرہ بیاہی تھیں، وہاں پہنچ کر جب انہوں نے اپنے ارادہ سے بہن کو مطلع کیا تو وہ بہت متفکر ہوئیں اور بھائی کے اس ارادہ کو جوش جوانی گردانتے ہوئے اپنے شوہر کے ذریعے ان کا تقرر جے پور کی عدالت میں بحیثیت محرر کرا دیا اور کچھ مدت کے بعد ان کا نکاح جے پور کے ایک شریف خاندان میں سید محمد علی کی صاحبزادی سے ہو گیا جو محکمۂ ڈاک میں ملازم تھے۔

شاہ صاحب کو قدرت نے چار بیٹوں اور تین بیٹیوں سے نوازا، بڑے بیٹے کا نام حکیم الطاف علی خاں تھا اور دوسرے بیٹے حضرت مولانا پروفیسر عبدالحئی فائزؔ صاحب ہیں جو معقولات ومنقولات میں کامل ہونے کے علاوہ ایک عمدہ مترجم اور قادرالکلام شاعر بھی ہیں، شاہ صاحب نے معرفت حق اور اصلاح نفس کی غرض سے سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ کے ایک صاحب نسبت بزرگ حضرت شیخ محمد علی شیر نقشبندیؒ سے بیعت کا سلسلہ قائم کیا جنہوں نے ان کو اجازت وخلافت کبریٰ عطا فرمائی حضرت مجدد الف ثانیؒ تک ان کا شجرۂ طریقت اس طرح ہے:۔

حضرت مولانا شاہ محمد ہدایت علی نقشبندی	(م ۱۳۷۰ھ)	مرید وخلیفہ
حضرت شیخ علی شیر نقشبندی	(م ۱۳۲۸ھ)	مرید خلیفہ
حضرت شیخ شیر محمد نقشبندی	(م ۱۳۱۷ھ)	مرید وخلیفہ
حضرت شیخ سید امام علی شاہ مکانوی نقشبندی	(م ۱۳۸۲ھ)	مرید وخلیفہ
حضرت شیخ سید حسین علی شاہ نقشبندی	(م ۱۲۴۴ھ)	مرید وخلیفہ
حضرت شیخ حاجی احمد نقشبندی	(م ۱۲۲۳ھ)	مرید وخلیفہ
حضرت شیخ محمد زماں نقشبندی	(م ۱۱۸۸ھ)	مرید وخلیفہ
حضرت شیخ محمد ٹھٹھوی نقشبندی	(م ۱۱۲۹ھ)	مرید وخلیفہ
حضرت شیخ زکی پارسا نقشبندیؒ	(م ۱۱۴۳ھ)	مرید وخلیفہ
حضرت شیخ محمد حنیف سرہندی نقشبندی	(م ۱۱۳۳ھ)	مرید خلیفہ
حضرت شیخ عبدالاحد سرہندی نقشبندی	(م ۱۱۲۷ھ)	مرید وخلیفہ
حضرت شیخ ابوسعید سرہندی نقشبندی	(م)	مرید وخلیفہ
حضرت شیخ محمد معصوم سرہندی نقشبندی	(م ۱۰۷۹ھ)	مرید وخلیفہ
حضرت شیخ احمد سرہندی نقشبندی معروف بہ مجدد الف ثانیؒ	(م ۱۰۳۴ھ)	

شاہ صاحب نے طویل عمر پائی اور ترانوے برس کی عمر میں ۱۷، جمادی الثانی ۱۳۷۰ھ (۲۶، جون ۱۹۵۱ء) کو داعی اجل کو لبیک کہا اور جے پور شہر میں شاہ جی کے قبرستان میں پیرومرشد کے قریب مدفون ہوئے مزار شریف پر پروفیسر عبدالحئی فائزؔ کا کہا ہوا قطعۂ تاریخ درج ہے:۔

علم باطن کا خزانہ لٹ گیا — آہ وہ مولیٰ کا انعام اٹھ گیا
ہاتف غیبی نے فائزؔ سے کہا — حسرتا! اک قطب اسلام اٹھ گیا (۳)

واہب العطایا نے شاہ صاحب کو تصنیف وتالیف نیز شاعری کا ذوق بھی عطا فرمایا تھا رشد وہدایت کے سلسلہ میں گوں ناگوں مصروفیات اور اسفار کی کثرت کے باوجود انہوں نے متعدد تصانیف یادگار چھوڑیں جن کا تعارف پیش خدمت ہے:۔

﴿۱﴾ درلاثانی خلاصۂ مکتوبات امام ربانی مجدد الف ثانیؒ:

حضرت شیخ احمد سرہندی معروف بہ مجدد الف ثانیؒ (۱۰۳۴-۹۷۱ھ) کے مکتوبات شریف میں معرفت الٰہی، ایمان و یقین، احسان و سلوک اور پند و موعظت جیسے اہم مضامین کو جس شرح و بسط، جوش و تاثیر اور درد و اخلاص سے بیان کیا گیا ہے اس سے ان کے مجددانہ و مجتہدانہ مقام و مرتبہ کا اندازہ ہوتا ہے، اس اہم، منفرد اور مفید تصنیف سے نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ہند کے علماء و مشائخ نے بھرپور استفادہ کیا ہے نہ صرف اہل حقیقت نے اسے حرز جان بنایا بلکہ علمی درسگاہوں نے بھی اس کی افادیت تسلیم کرتے ہوئے داخل نصاب کیا افادۂ عام کی غرض سے مختلف زبانوں میں اس کے تراجم بھی مرحلۂ اشاعت سے گزر کر مقبول خاص و عام ہوئے حق یہ ہے کہ سیکڑوں برس گذرنے کے باوجود آج تک اس کی اثر آفرینی، شگفتگی، تازگی، دل پذیری اور کیف و کم میں کوئی فرق نہیں آیا یہ مکتوبات تین دفتروں پر مشتمل ہیں۔

دفتر اول میں تین سو تیرہ مکتوبات ہیں، پہلا مکتوب حضرت خواجہ باقی باللہؒ اور آخری مکتوب خواجہ ہاشم کشمی کے نام ہے اس کو حضرت مجددؒ کے خلیفہ مولانا یار محمد جدید بدخشی طالقانی نے ۱۰۲۵ھ نے ترتیب دیا۔

دفتر دوم میں مکتوبات کی تعداد ننانوے ہے، پہلا خط شیخ عبدالعزیز جونپوری کے نام ہے اور آخری خط کے مکتوب الیہ میر محمد نعمان بدخشی ہیں یہ دفتر حضرت خواجہ محمد معصوم نقشبندی کے ارشاد پر مولانا عبدالحیٔ حصاریؒ نے ۱۰۲۸ھ میں مدون کیا۔

تیسرا دفتر ایک سو چودہ خطوط پر مشتمل ہے اسے مولانا محمد ہاشم کشمی نے ۱۰۳۱ھ میں مرتب کیا بعد کے دس مکتوبات کو شامل کرنے کے بعد اب اس دفتر میں مکتوبات کل تعداد ایک سو چوبیس ہوگئی ہے۔

مکتوبات شریف کے خطی نسخے مختلف لائبریریوں، میوزیموں، ذاتی ذخیروں اور خانقاہوں میں موجود ہیں، مطبع نول کشور سے اس کے متعدد ایڈیشن حلیۂ طبع سے پیراستہ ہوئے، دہلی میں مطبع احمدی اور مطبع مرتضوی سے بھی اس کے متعدد اڈیشنوں کی اشاعت عمل میں آئی، ان مطابع کے علاوہ برصغیر کے دیگر اہم شہروں میں مختلف مطابع نے ان مکاتیب کو زیور طبع سے آراستہ کیا۔

شاہ صاحب موصوف نے سلیس و سادہ اردو میں مکتوبات شریف کا خلاصہ کر کے تصوف کا ذوق رکھنے والوں پر بڑا احسان کیا ہے، کیونکہ اس تلخیص کا مطالعہ کرنے والا ایک معمولی اردو خواں بھی حضرت مجددؒ کے افکار و خیالات نیز تعلیمات سے واقف ہوسکتا ہے وجہ تالیف میں خود فرماتے ہیں:۔

''مکتوبات امام ربانیؒ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ چونکہ جامع دقائق شریعت و جامع حقائق طریقت و جامع اسرار حقیقت و جامع رموز و معارف معرفت ہیں اور زبان فارسی میں ہیں اور فارسی بھی چار سو سال کی پرانی ادق ہے، اس لئے اکثر لوگ اس فارسی کو پوری طور پر نہیں سمجھتے، اور جو لوگ اس فارسی کو جانتے ہیں تو اصطلاحات تصوف سے پورے واقف نہیں اور اصطلاحات تصوف سے واقف ہیں تو اسرار و معارف کے معلومات میں ان کو دخل نہیں ان وجوہات متذکرہ بالا سے انوار و فیوض مکتوبات سے محروم رہتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اس لئے میں نے خیال کیا کہ۔۔۔۔۔۔۔۔تو ان مکتوبات کا زبان اردو میں خلاصہ کرتا کہ عام مسلمان ان کے فیض سے مستفیض ہوں۔'' (۴)

شاہ صاحب نے خلاصہ کے علاوہ مشکل مضامین کی شرح ''آگاہی'' کے عنوان سے کی ہے تا کہ قاری کو ان کے مطالب و مفاہیم سمجھنے میں آسانی ہو، اس کے علاوہ سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کی اہم اصطلاحات کی تشریح بھی کردی، جن کی تفہیم کے بغیر مکتوبات کے

معارف وحقائق تک رسائی ناممکن ہے چند اصطلاحات اس طرح ہیں۔ وحدت الوجود، وحدت شہود، ولایت صغریٰ، ولایت کبریٰ، حقیقت ممکنہ، ظلال وغیرہ۔

نمونہ کے طور پر دفتر سوم کے ایک مکتوب کا خلاصہ اور اس پر شاہ صاحب کی آ گاہی ملاحظہ ہو:۔

مکتوب اول:۔ مکتوب الیہ میر محمد نعمان بدخشی، ''در بیان اقربیت افعال وصفات وذات واجبی''

خلاصۂ مکتوب: ذات حق سے صفات حق اور صفات سے افعال اور افعال سے وجود ہر شئے کا ہے لیکن ہر ایک کے وجود سے ذات حق اقرب ہے کیونکہ ہر شئے اپنا وجود خود نہیں رکھتی ان کی ہیئت (صورت) ان کی ماہیت (حقیقت) ہے۔

آ گاہی:۔ مثلاً قیام جسم وقیام صورت روح سے ہے اور روح نہ عین جسم ہے نہ عین صفات لیکن روح ہر عضو سے قریب تر ہے۔

یا مثلاً تخم درخت، نہ صورت درخت ہے، نہ شاخ، نہ پتہ، نہ پھل، نہ پھول، لیکن ان سب کے وجود سے تخم درخت اقرب ہے علیٰ ھذا القیاس لیکن ذات حق کا ہر شئے سے اقرب ہونا ان تمثیلات سے بھی وراء الوراء ہے۔

قرب بے چون ست عقلت رابتو — آن تعلق ہست بیچوں اے عمو
اتصالے بے تکیف بے قیاس — ہست رب الناس را با جان ناس
او نمی گنجد بہ میزان خرد — تو ترازوِ خرد را بر درد
اے بروں از وہم و قال و قیل من — خاک بر فرق من و تمثیل من

معیار السلوک و دافع الاوھام الشکوک:۔ شاہ صاحب کی مہتم بالشان تالیف معیار السلوک ہے، جو دیباچہ سات ابواب اور ضمیمہ پر منقسم ہے، پہلے باب میں عقائد، اثبات ولایت، علم باطن کی فرضیت، تلاش مرشد، اثبات بیعت، حقوق پیر وآداب اور پیر کی حیات میں دوسرے پیر سے اخذ بیعت جیسے اہم امور کا تفصیلی بیان ہے۔ دوسرا باب طریقۂ نقشبندیہ، نقشبندیہ مجددیہ، کلمات نقشبندیہ، رابطۂ مرشد، فوائد صحبت نیک، نقصانات صحبت بد اور فوائد خاموشی پر مشتمل ہے۔ تیسرے باب میں فضائل وترغیب ذکر و مذمت دنیا فضائل ذکر خفی، سلطان الاذکار، دائرۂ امکان، دائرۂ ولایت صغریٰ، دائرۂ ولایت کبریٰ اور ولایت علیا کو نہایت شرح وبسط سے بیان کیا گیا ہے۔ چوتھے باب میں کمالات نبوت، کمالات رسالت، کمالات اولوالعزم، حقیقت کعبہ، حقیقت قرآن، حقیقت صلوٰۃ اور حقیقت معبودیت کو دائروں کے ذریعہ ذہن نشین کر دیا گیا ہے۔ باب پنجم میں دائرۂ حقیقت ابراہیمی، دائرۂ حقیقت موسوی، دائرۂ حقیقت محمدی، دائرۂ حقیقت احمدی، دائرۂ حب صرفہ، دائرۂ لاتعین اور دائرۂ سیف قاطع و دائرۂ منصب قیومیت کا نہایت دل نشین انداز میں تعارف کرایا گیا ہے۔ چھٹے باب میں مرید اور مرشد سے متعلق اہم باتیں بیان کرنے کے بعد نمازوں، وظائف، دعائے حذب البحر اور ختم خواجگان کا تفصیلی بیان ہے۔ ساتویں باب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین ائمۂ طریقت کے علاوہ سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے مشائخ اور اپنے مشائخ کے حالات وارشادات کو نہایت پر تاثیر انداز میں بیان کیا ہے۔ ضمیمہ میں تصوف سے متعلق انچاس (۴۹) معیار تجویز کئے ہیں جن پر عمل سے سعادت دارین حاصل ہوسکتی ہے، اسی کے ساتھ کچھ تعویذات اور شجرۂ سلسلہ بھی تحریر کیا ہے تعویذات کے سلسلہ میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس کی اجازت تمام مومنین کو عام ہے، آفرین فارسی اور اردو میں حمد و نعت ومنقبت درج ہیں جس سے مصنف علام کے ذوق شعری کا پتہ چلتا ہے۔

معیار السلوک کا پہلا ایڈیشن معارف پریس اعظم گڑھ سے ۱۹۳۶ء/۱۳۵۵ھ شائع ہوا صفحات کی تعداد ۳۰۰ ہے نسخوں کی تعداد ایک ہزار تھی، دوسرا ایڈیشن بھی ایک ہزار نسخوں پر مشتمل تھا اور حاجی محمد بشیر صاحب چھاؤنی کانپور کے اہتمام سے مطبع انتظامی کانپور سے شائع ہوا صفحات کی تعداد ۳۰۲ ہے، تیسرا ایڈیشن حکیم سید محمود علی شاہ کراچی کے اہتمام سے چھپا، چوتھا ایڈیشن شعبۂ نشر و اشاعت جامعہ ہدایت کی طرف سے ۱۴۰۴ھ میں چھپا، پانچواں ایڈیشن ماضی قریب میں شعبۂ نشر و اشاعت کی جانب سے حال ہی میں شائع ہوا ہے جس کی تفصیلات راقم السطور کو دستیاب نہیں۔ معیار السلوک کے دو گجراتی ایڈیشن بھی زیور طبع سے آراستہ ہوئے ہیں۔

معیار السلوک علم تصوف میں ایک اہم اضافہ ہے مولف علیہ الرحمہ نے نہایت صاف اور سلیس اردو میں وحدت وجود، وحدت شہود، ہمہ اوست، ہمہ از اوست، فنا و بقا، اقسام ولایت، جواز بیعت اور دیگر مسائل تصوف کو عام فہم اور دل نشین انداز میں بیان کیا ہے خاص طور پر اصطلاحات تصوف کی تشریح جس بلیغ پیرایہ بیان میں کی ہے اردو زبان کی کسی کتاب میں اس کی مثال نہیں ملتی، معیار السلوک معارف پریس کا یہ اشتہار ہمیں صداقت پر مبنی نظر آتا ہے:۔

''تصوف کے خزانہ کی کنجی، صراط مستقیم کی کسوٹی، مبتدی اور منتہی کے لئے دستور العمل، سیدھی سادی اردو زبان میں تصوف کے ادق مسائل کا حل، پیر اور مرید کے کام کی باتیں، ایمان کی تازگی اور استواری کا ذریعہ، روحانی ترقی کا راز، دل کی پاکیزگی اور دماغ کی روشنی کا نسخہ زبان اردو کی مایہ ناز تصنیف اور علم تصوف میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔''

فتوح الحرمین فی مبشرات رسول الثقلین:۔ ۱۲۶۵ھ میں شاہ صاحبؒ حج بیت اللہ کی سعادت سے مشرف ہوئے تصنیف مذکور میں انہوں نے اپنے واردات قلبی مکشوفات نیز رسول ﷺ کی عنایات و الطاف کو ایسے مؤثر انداز میں بیان کیا ہے جس سے ایمان تازہ ہوتا ہے، اور عمل نیک کی رغبت ہوتی ہے، زیارت حرمین شریفین سے متعلق ان کی تعلیمات و ارشادات سے رجوع الی اللہ کا ذوق و شوق ہوتا ہے، چونسٹھ (۶۴) صفحات پر مشتمل یہ کتاب حسن برقی پریس مرشد آباد پیلیس لکھنؤ سے شائع ہوئی سنہ اشاعت درج نہیں ہے حج کے سلسلہ میں ان کی دل کو تڑپا دینے والی تحریر ملاحظہ ہو:۔

''مساوات اسلامی عملاً صرف حج کی ادائگی میں ہے، اگرچہ نماز میں شاہ و گدا ایک صف میں برابر ہوتے ہیں لیکن لباس میں ہر ایک کے پھر بھی امتیاز ہوتا ہے، مگر حج کے موقع پر یہ امتیاز ہی مٹ جاتا ہے، حالت احرام میں بادشاہ ہو یا وزیر، امیر ہو یا فقیر، آقا ہو یا غلام، شریف ہو یا رذیل، عالم ہو یا جاہل، کالا ہو یا گورا، شرقی ہو یا غربی، عربی ہو یا ہندی، سب ننگے سر اور ایک سفید تہبند باندھے ہوئے اور ایک سفید کپڑا اوڑھے ہوئے ہوتے ہیں وہ بھی بغیر سلا۔'' (۶)

مدینہ منورہ کا ذکر آتے ہی ہر مومن کا قلب عجیب و غریب کیفیات سے دوچار ہوتا ہے اس کی ترجمانی اردو شاعر اس طرح کرتا ہے:۔

یاد آئی کھجوروں کی جھرمٹ   تیز ہونے لگی دل کی دھڑکن

شاہ صاحب نے اس مقدس و متبرک شہر میں حاضری کے آداب اس طرح بتائے ہیں:۔

۱۔ جہاں تک ہو سکے مدینہ میں باوضو رہے

۲۔ آمدورفت میں اس کا پورا خیال رہے کہ روضۂ پاک کی طرف پشت نہ ہونا چاہئے۔

۳۔ مدینہ پاک کے رہنے والوں کی تعظیم وتکریم کرے ان پر غصہ نہ کرے۔

۴۔ اون کے کاموں پر اعتراض نکرے اور اون پر بدگمانی نہ کرے ان کے خوش کرنے سے حضورؐ خوش ہوتے ہیں اور ناخوش کرنے سے حضورؐ آزردہ ہوتے ہیں، میرا خود بھی یہی تجربہ ہے۔

۵۔ مدینہ پاک کی کسی چیز کی برائی نہ زبانی کرے نہ دل میں کرے حضورؐ کو وہاں کی ہر چیز محبوب ہے۔ (۷)

تعالی اللہ کیا پر نور یہ شہر مدینہ ہے — کہ جس کا ذرہ ذرہ رحمتوں کا اک خزینہ ہے
حرم جنت سے بہتر ہے تو قبہ عرش سے بہتر — محمد مصطفیٰؐ کے یہ معارف کا خزینہ ہے
گلی کوچہ در و دیوار پر انوار کی رحمت — بھلا کیسے نہ ہو محبوب حق کا یہ مدینہ ہے
عجب شان رسالت ہے عجب نور ولایت ہے — کہ جس کے نور سے معمور ہر مسلم کا سینہ ہے
عجب تسکین دہ ہے یہ مبارک شہر مسلم کو — قناعت صبر و حلم و خلق تابوت سکینہ ہے
الٰہی حب ختم المرسلین مجھ کو عطا فرما — کہ تیری معرفت اور قرب کا یہ خاص زینہ ہے
نہ مجھ جیسا کوئی امت میں عاصی اور خاطی ہے — شفاعت میں نہ کوئی ہمسر شاہ مدینہ ہے
محبت احمد مختار کی تکمیل ایماں ہے — یہی ہے علم سینہ اور یہی علم سفینہ ہے
ہدایت پر عنایت ہو ہمیشہ یا رسول اللہؐ — یہ دربار رسول پاک کا ادنیٰ کمینہ ہے۔ (۸)

احسن التقویم فی اثبات ذات واجب القدیم:۔ متوسط تقطیع کے اکیس سطری ۱۶۵ صفحات پر مشتمل اپنی نوعیت کی منفرد تصنیف کا سال تالیف ۱۹۳۸ء ہے جو اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد سے اشاعت پذیر ہوئی، اس کتاب میں احسن التقویم کی تفسیر وتشریح، انسان کی ماہیت قدرت کاملہ کی حکمت کو نہایت شرح وبسط سے بیان کیا گیا ہے، اس کے علاوہ قدیم وحادث میں فرق، انسان کی تخلیق کا راز، معرفت جزوی وکلی کے وسائل، شریعت وطریقت کے اہم مسائل اور اثبات ذات واجب الوجود کے لئے عقلی ونقلی دلائل کا ذکر نہایت دل نشین انداز اور فکر انگیز پیرایہ بیان میں کیا ہے۔

تمہیدی سطور اس طرح ہیں:۔

وجود مخلوقات اور ان کے حرکات وسکنات واثرات ذات واجب الوجود کی خبر دے رہے ہیں، آسمان کی گردش اور بلندی بلاستون قیام اور شمس وقمر ونجوم کی روشنی اور صبح وشام، پہاڑوں کی بلندی، زمین کی پستی، دریا کی روانی، شجر وثمر کا ذائقہ واثر، رنگ وبوئے گل، یہ کل چیزیں صانع حقیقی کی صنعت، قادر مطلق کی قدرت اور ذات واجب الوجود کے وجود کی رہنمائی کر رہی ہیں۔ (۹)

اپنی تالیف کی تسمیہ کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:۔

''۔۔۔۔۔۔۔۔حق تعالیٰ نے قرآن مجید کی سورۂ والتین میں محاورۂ عرب کے موافق چار چیزون کی قسمیں کھا کر بشر کو احسن التقویم فرمایا ہے، اور یہ لقب احسن التقویم'' سوائے بشر کے نہ ملائکہ کے واسطے فرمایا نہ عرش کے واسطے، نہ کعبہ وطور کے واسطے نہ جنت و حور وقصور کے لئے بایں وجہ میں نے بھی اس کتاب کا نام ''احسن التقویم'' رکھا ہے، حضرت مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی بشر کے متعلق

میں یہ فرمایا ہے:۔

''احسن التقویم'' در والتین بخواں — کہ گرامی گوہر است اے دوست جہاں
''احسن التقویم '' از فکرت برون — ''احسن التقویم'' از عرشش فزوں
کعبہ ہر چندے کہ خانہ برّ اوست — خلقت ما نیز خانہ سرّ اوست۔ (۱۰)

آخر میں عمل پیہم اور جہد مسلسل کی ترغیب وتحریص ان الفاظ میں دلاتے ہیں:۔

''اے عزیز قاری یا سامع اپنی ہمت بلند رکھ اگر چہ نبوت ختم ہو چکی ہے لیکن ولایت ختم نہیں ہوئی ہے، یاد خدا میں مشغول ہو، خاصان خدا کی صحبت اور خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کر یہ جہاں دار العمل ہے اور دار جزا و سزا آنے والا ہے من طلب وجد عام ہے، اپنی پستی کو بلندی نجان، عقل وشعور سے کام لے، تو تمام مخلوق سے بہترین مخلوق ہے، آخر تو کرمنا بنی آدم و احسن تقویم کے لقب سے مشرف ہے کوشش کر انشاء اللہ ضرور کامیابی ہوگی، جب بندے کے دروازے سے بندہ خالی ہاتھ نہیں آتا تو دروازۂ حق تعالیٰ سے بندہ خالی ہاتھ کیسے آسکتا ہے، لیکن دروازۂ غنی پر فقیر کا پہنچنا اور سوال کرنا ضروری ہے چنانچہ حضرت مولانا رومیؒ غیرت دلا کر فرماتے ہیں:۔

آخر آدم زادۂ اے ناخلف — ہر چہ پنداری تو پستی را شرف
مرغ را پر می برو بر آشیاں — پرّ ہمت مردم ست اے مرداں
گفت پیغمبر کہ چوں کوبی درے — عاقبت زاں در بروں آید سرے۔ (۱۱)

مندرجہ بالا کتب کے علاوہ شاہ صاحب موصوف نے عروۃ الوثقی حضرت خواجہ معصوم نقشبندیؒ کے خطوط نیز مثنوی مولانا رومؒ کا خلاصہ بھی کیا تھا لیکن میری معلومات کے مطابق ابھی تک یہ تصانیف تشنۂ طباعت ہیں۔شاہ صاحب موصوف کو واہب العطایا نے ذوق شعری بھی عطا کیا تھا ان کے واردات قلبی فارسی و اردو دونوں زبانوں میں ملتے ہیں نمونہ کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

مناجات

اے خدا ذات تو بے نام و نشاں — پاک ہست از شش جہت ظاہر نہاں
اے خدا اے سر بلند از ہر صفت — ہیچ کس نے دان و نے بیند رخت
اے خدا بیروں از علم قال و حال — اے خدا بیروں ہمہ کشف و کمال
اے خدا بیروں ز اوقات زماں — اے خدا بیرون ز ادراک و بیان
صد ہزاراں انبیاء صاحب کمال — آرزو دارند نہ دیدند آں جمال
در شب معراج ختم الانبیاء — دید حق دانستہ رب جل و علا
یافت از حق تاج ما زاغ البصر — قاب قوسین دنیٰ خیرالبشر۔(۱۲)

بہتر و مہتر ز مخلوقات کل — مجتبےٰ و مصطفےٰ شاہ رسل

باعث خلق جہاں رحمت خدا — مونس مسکیں، شفیع روز جزا
منبع جود و کرم خلق عظیم — آں محمدؐ، احمدؐ، حامدؐ، رحیم

اے خدا خواہم کہ در محشر مرا — در صف سگہا مدینہ کن مرا
اے خدا این نعت سرور کائنات — تو برائے من بکن حجت نجات۔ (۱۳)

کیا صورت و کیا خلق ہے کیا شان محمدؐ — مخلوق بھی خالق بھی ثنا خوان محمدؐ
رتبہ کا بیاں انکے عیاں را چہ بیاں ہے — جبریل امیں خادم و دربان محمدؐ
جو اہل عرب گونگا بتاتے تھے جہاں کو — سب گنگ ہوئے جب سن لیا فرقان محمدؐ
قرآن کے شارح ملک و جن و بشر ہیں — قرآن ہے شارح رخ رخشان محمدؐ
صدیقؓ و عمرؓ حضرت عثمانؓ و علیؓ سب — یہ پھول معطر ہیں گلستان محمدؐ
اولاد نبی پاکؐ کی اور زوجہ اطہار — یہ سب ہیں گل و رنگ گلستان محمدؐ
جاں لاکھ ہدایت کو عنایت ہوں الٰہی — کرتا رہوں قرباں سگ دربان محمدؐ۔(۱۴)

حواشی:۔

(۱)ماہنامہ ہدایت جلد۳، شمارہ۱، ص۳۰، خصوصی اشاعت حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم مجددی حیات وخدمات (نومبر۱۹۹۴ء)، (۲)ایضاً ص ۲۲۔۲۰، (۳)ایضاً ص ۵۷ و انتخاب مکتوبات امام ربانی، تصوف سوسائٹی سندھ یونیورسٹی حیدرآباد (ص۴)، (۴)دیباچہ درلاثانی جلد سوم ص۴، ص۹، (۵)درلاثانی ص۱، (۶)فتوح الحرمین، (۷)فتوح الحرمین، (۸)ایضاً ص۶۴۔۶۳، (۹)احسن التقویم ص۴، (۱۰)ایضاً ص ۵۔۴، (۱۱)ایضاً ص ۱۶۵۔۱۶۴، (۱۲)معیار السلوک ص ۲۹۴، (۱۳)ایضاً ص ۲۹۹۔ ۲۹۷، (۱۴)ایضاً ص ۳۰۰۔ ۲۹۹

کتابیات:۔ (۱)احسن التقویم۔شاہ ہدایت علی نقشبندیؒ۔اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن ۱۹۳۸ء، (۲)انتخاب مکتوبات ربانی (۳ جلدوں میں) شاہ ہدایت علی نقشبندی، تصوف سوسائٹی حیدرآباد، سندھ سال ندارد، (۳)درلاثانی۔شاہ ہدایت علی نقشبندی (۳ جلدوں میں) انتظامی پریس کانپور۔سال ندارد، (۴)فتوح الحرمین۔شاہ ہدایت علی نقشبندی، حسن برقی پریس، مرشد آباد پیلیس لکھنؤ (سال ندارد)، (۵)معیار السلوک، معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۳۶ء

دکنی شاعری کی ماہ تمام ۔ چندا بائی ماہ لقا

ڈاکٹر شاہد نوخیز اعظمی، شعبۂ فارسی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ۔ ۳۲

تہذیب وتمدن اور تزک وثقافت کا گہوارہ دکن ہمیشہ سے ہی سیاسی فتوحات، سماجی روایات، معاشرتی مساوات، اور نسائی احساسات، کا علم بردار رہا ہے، اس مقدس سرزمین کو کاتب تقدیر نے بلاتمیز مرد وزن صلاحیت، سیرت، صورت اور شرافت سے مالا مال کیا، تاریخ وادبیات کی کرنیں جیسے جیسے منور ہوتی گئیں اس خطہ پر اسکی ضیا پاشیاں بھی بڑھتی گئیں شب وروز کی گردش نے اس حسن کو حسنِ روز افزوں کر دیا، شہیدوں کے خون، غازیوں کی دعاؤں اور صوفیوں کی صداؤں سے ویرانیاں آبادیوں میں تبدیل ہوئیں بارہ دریاں آراستہ ہوئیں اور حویلیوں میں شہنائیاں گونج اٹھیں انہیں درباروں اور ڈیوڈھیوں کے علمی وادبی ستونوں اور سپوتوں نے اپنے علم، ہنر، فن، موسیقی اور شاعری کے ذریعہ سکوت وجمود کو توڑ کر حرارت وحرکت پیدا کی، تا کہ زندگی کو بال وپر میسر ہوں اور وہ محو پرواز ہو سکے، محمد بن تغلق کی لیاقت وفراست، سلطنت بہمنیہ کی علمیت وفضیلت، قطب شاہوں کی رعنائی وبرنائی، عادل شاہیوں کے عدل وامن، اور آصف جاہیوں کے علم وفضل، شان وشوکت اور فہم وتدبیر نے اس ارض پاک کو ایسا حسین بنا دیا کہ نہ صرف نسل جہان فانی بلکہ ستارۂ آسمانی بھی رشک کرنے لگے جہاں ایک طرف گولکنڈہ ہیبت واستقامت کا درس دے رہا ہے، چار مینار عظمت ووسعت کے نعرے بلند کر رہا ہے اور ان کو چومتی، جھومتی اور سانس کے تسلسل کو تقویت بخشتی ہوائیں اور فضائیں موسیقی وشعر وشاعری کے گیت گا رہی ہیں تو دوسری طرف علم وہنر اور تحقیق وفن کی تائید میں سنگ پہ سنگ چڑھکر تقلید پہ تحقیق کی بالادستی اور فتح مندی کا اعلان کر رہے ہیں یہی وہ خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے دکن کو نہ صرف مشرق ومغرب کے جمال بلکہ بیشتر فن کمال پر اولیت وافضلیت حاصل ہے۔ تاریخ شاہد ہے سرزمین دکن نے شعر وادب کو صرف پہلا شاہنامہ نگار پہلا صاحب دیوان شاعر اور پہلی صاحب دیوان شاعرہ ہی نہیں عطا کی بلکہ صنف مثنوی، رباعی، غزل، اور مرثیہ کی داغ بیل بھی یہیں پڑی، عصامی، فیروز شاہ بہمنی، نظامی بیدری، گیسو دراز، فیروز بیدری، ملا وجہی، غواصی، قلی قطب شاہ، ولی دکنی، بی بی فتح ملک، لطف النساء امتیاز اور چندا یہ وہ اولین ستارے ہیں جنکی کرنوں نے نہ صرف دکنی ادبیات کو تابانی بخشی بلکہ عالمی ادبیات کو توانائی بھی بخشی بیشتر اداروں اور متعدد علاقوں کے ادیبوں اور شاعروں نے زیادہ تر علمی پنکھڑیاں اسی گلستان دکن سے مستعار لیا ہے۔

دبستان دکن میں شعراء کی طرح شاعرات کی نہ صرف ایک طویل فہرست ملتی ہے بلکہ صاحب دیوان شاعرات بھی کثرت سے نظر آ رہی ہیں جن میں بیشتر کے دیوان نادر الوجود ہیں جیسے جیسے محققین ان تک رسائی حاصل کرتے ہیں انکی اولیت اور افضلیت کے تاج تبدیل ہوتے رہتے ہیں کچھ دنوں قبل تک چندا ماہ لقا پہلی صاحب دیوان شاعرہ سمجھی جاتی تھی جیسے ہی لطف النساء امتیاز کا دیوان دستیاب ہوا اولیت کا تاج ان کے سر آ گیا اور اب جدید تحقیق یہ اشارہ دے رہی ہے کہ بی بی فتح ملک اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ ہیں جبکہ مزید تحقیق کے دروازے ہنوز کھلے ہوئے ہیں اگر چہ بی بی فتح ملک کو اولیت اور امتیاز کو فضیلت حاصل ہے لیکن شہرت کا تاج ہمیشہ چندا ہی کے سر رہا۔ چندا دعاؤں، مسرتوں اور نجومیوں کی پیش گویوں کے بیچ پیدا ہوئی رکن الدولہ کے حسین محل کے خوشگوار ماحول میں پلی بڑھی اور پروان چڑھی، نظام الملک آصف جاہ ثانی، سکندر جاہ ثالث، ارسطو جاہ، میر عالم، راجہ راؤ رنبھا اور مہاراجہ چندو لعل شاداں کے دربار سے وابستہ رہی غلام مہدی، خوشحال انوپ اور پنا نقال بھانٹ، سے کسب فیض کیا، شاہ نصیر، شیر محمد خان ایمان، حفیظ، صدیق قیس، صفا، غلام

مصطفیٰ خان، ذوالفقار علی خان، مرزا علی لطف اور تاج الدین مشتاق معاصر شعراء تھے، جن میں ایمان، میر عالم، گوبند بخش ضیائی اور جو ہر ماہ لقا سے بہت متاثر تھے اور چندا بھی انسے اثر قبول کرتی تھی انمیں تقریباً تمام شعرا نے چندا کی تعریف کی لیکن میر عالم، ایمان، جوہر اور ضیائی تو باقاعدہ چندا کی تعریف میں مثنوی سرا تھے، چندا کی ولادت، ولدیت اور عرفیت میں اختلاف پایا جاتا ہے، نصیر الدین ہاشمی ''کاروان سخن'' ۱۹۵۶ء میں چندا بائی ماہ لقا کے بارے میں صفحہ ۳۳ پر لکھتے ہیں کہ:۔

''ماہ لقا بائی المتخلص بہ چندا وہ خوش قسمت اور خوش نصیب رقاصہ تھی جسکا تذکرہ نہ صرف گذشتہ زمانے کی تاریخوں میں ہے، بلکہ زمانہ حال کے مضمون نگاروں نے بھی اسکا حال قلمبند کرنا ضروری تصور کیا ہے، ماہ لقا بائی کا باپ مرزا سلطان بلخ سے ہندوستان آیا تھا شاہ عالم کے زمانہ شہزادگی میں اسکو خانی کا خطاب ملا تھا اسکی ماں راج کنور بائی گجرات کی رہنے والی تھی، ۱۱۷۸ھ میں ماہ لقا کی ولادت ہوئی اسکی خالہ مہتاب کنور بائی کو رکنالدولہ میر موسیٰ خاں مدارالمہام وقت نے اپنے عقد میں لیکر صاحب جی خانم کا خطاب دیا تھا صاحب جی خانم نے اپنی لاولدی کی وجہ سے ماہ لقا کو گود لے لیا تھا''

جبکہ ڈاکٹر ثمینہ شوکت اپنی کتاب ماہ لقا کے صفحہ ۱۹،۲۱ پر لکھتی ہیں کہ:۔

''چندا کی ولادت ۱۸ ذی القعدہ ۱۱۸۱ھ بمطابق ۱۷۶۷ء کو پیر کے دن ہوئی اس کا نام نانی کے نام پر چندا بی بی رکھا گیا چندا کے دادا یعنی بسالت خان کے باپ مرزا سلطان نظر کا شمار امراء میں ہوتا تھا سلطان نظر بلخ کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔''

راحت عزمی چندا کے تخلص القاب اور اسماء کے بارے میں اپنی تصنیف ماہ لقا کے صفحہ ۱۴ پر رقمطراز ہیں کہ:۔

''ماہ لقا کا اصلی نام چندا بیبی تھا، ماہ لقا خطاب، اور چندا تخلص اور بائی گردش دوراں کا اضافہ تھا، ماہ لقا کے باپ کا نام بہادر خان تھا بسالت خاں اس کا موروثی خطاب تھا بہادر خان کے باپ کا نام مرزا سلطان نظر تھا۔''

اور ڈاکٹر نسیم اورینٹل کالج میگزین پاکستان فروری ۱۹۶۰ء کے صفحہ پر یوں لب کشاں ہیں:۔

''چندا ایک اونچے گھرانے کی عورت تھی اس کا باپ مرزا سلطان بلخ سے ہندوستان آیا تھا شاہنواز خان نے مآثر الامراء میں لکھا ہے کہ وہ شاہ عالم کی شہزادگی کے زمانہ میں صلابت خان اور بادشاہی زمانہ میں بسالت خاں کے خطاب سے بخشی فوج کے عہدہ پر ممتاز تھا اسکی شادی گجرات کی ایک حسینہ راج کنور بائی سے ہوئی تھی اسی راج کنور بائی کی کوکھ سے ۱۱۷۲ھ (۱۷۵۸ء) میں چندا پیدا ہوئی۔''

غلام حسین خان جوہر کے فارسی مخطوطہ ماہنامہ کی یہ عبارت تمام اختلافات کو دور کر دیتی ہے:۔

''تاریخ ولادت بیستم ماہ ذی قعدہ سنہ یک ہزار و یک صد و ہشتاد یک مقدسہ روز دوشنبہ دو گھڑی روز برآمد۔'' (ماہ نامہ مخطوطہ صفحہ ۲۱۲)

اسی تاریخ ولادت کی تائید غلام ھمدانی گوہر کی اس تحریر سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے حیات ماہ لقا صفحہ ۱۹ پہ کی ہے جو اس طرح ہے:۔

''بتاریخ ۲۰ ذی قعدہ ۱۱۸۱ھ روز دوشنبہ کو جب آفتاب عالم تاب دو نیزے برابر آیا ساعت قمر میں ایک ماہ پیکر حور منظر لڑکی تولد ہوئی نجموں نے چندا بی بی نام رکھا۔''

اس طرح مستند تاریخوں اور حوالوں کی شہادت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ چندا بی بی اس کا نام بہادر خان اس کے والد کا نام

بسالت خاں اس کا موروثی خطاب تھا بہادر خاں کے والد یعنی چندا کے دادا کا نام مرزا سلطان نظر تھا مرزا سلطان نظر کا انتقال ۱۱۲۷ھ میں ہوا جبکہ چندا ۱۱۸۱ھ میں پیدا ہوئی اس لئے چندا سلطان نظر کی بیٹی ہو نہیں سکتی چندا کے نانا کا نام خواجہ محمد حسین خان اور نانی کا نام چندا بی بی تھا چندا کے دادا کے متعلق مشہور مورخ اور صاحب گلزار آصفیہ جواہر مخطوطہ ماہ نامہ کے صفحہ ۲۰۰ پر لکھتے ہیں کہ:۔

''شریف الخاندان خواجہ محمد حسین متوطن بار ہہ سادات زید یست در کمال علو فطرت در معاملات ملکی ماہر و در ہم چشماں سلیقہ شمار مفاخر بود۔''

غلام حسین خان جو ہر ماہ نامہ کے اسی صفحہ چندا کی نانی کے خاندان، صفات اور جمال کے متعلق لکھتے ہیں کہ:۔

''بزرگی از خواجگان متوطن کاٹھیا راڑ در بلدہ گجرات طرح اقامت افگندہ بود و از تمول و فراغت استغنا تا فلک افراشت دختری داشت ماہ پیکر حور لقا کہ پالیش سرو شمشاد و عارضش اب ورنگ از رخ گل می بر دو پری دیوانۂ جمالش گشتہ بر ناز دکرشمۂ او حال می سپرد۔''

خواجہ محمد حسین کو کل انیس (۱۹) اولادیں پیدا ہوئیں جن میں زیادہ تر بچپن میں ہی انتقال کر گئیں صرف پانچ کو پوری عمر مل سکی جن کے متعلق جو ہر مخطوطہ ماہ نامہ میں لکھتے ہیں کہ:۔

''دو فرزند نرینہ یکے موسوم بہ غلام حسین خان و دویمی موسوم بہ غلام محمد واز اناث سہ (۳) دختر نیک اختر یکی مسماۃ نور بی بی، دویمی مسماۃ پولن بی بی، سیومی مسماۃ میدا بی بی یعنی راج کنور بائی ثمرہ ثمرہ جبین حدیقہ عمر عزیز گردیدندہ۔''

اس طرح یہ ثابت ہوا کہ غلام حسین اور غلام محمد چندا کے ماموں نور بی بی و پولن بی بی چندا کی خالہ اور میدا بی بی چندا کی ماں تھیں چندا ننھال و ددھال دونوں طرف سے اعلیٰ خاندان سے تھی اس کے دادا والد اور والدہ سب ہی متقی و پرہیز گار تھے جلال بلخ اور جمال گجرات اسے وراثت میں ملا تھا یہی حسن و اعلیٰ ظرفی اسکی زندگی کے ہر موڑ پر دکھائی دیتا ہے۔ چندا کی پیدائش پر طرح طرح سے قیاس آرائیاں ہوئیں ادباء نے اقبال بلند بتایا تو امراء نے معیشت و حکومت کے لئے نیک فعال سمجھا، نجومیوں نے خوشبخت خوش نصیب رونق دکن و انوار دکن کی پیشن گوئی کی جبکہ غلام حسین جو ہر اس کی ولادت کو ایک معجزہ قرار دیتے ہیں خود انہیں کے الفاظ میں سنئے:۔

''چندا کی پیدائش پر کمرے میں ایک نور پھیل گیا، ولادت کی خوشی میں بسالت خاں کے گھر میں مسرتوں کے شادیانے بجے ایک سخنور نے تہنیت میں غزل سرائی کی تھی شعر:۔

بحمد اللہ کہ ساز جشن باز اندر نوا آمد — چو زہرہ بر زمیں از سطحٔ اوج سما آمد
نوائے نغمہ با انفاس عیسیٰ ھم نفس گشتہ — چون چندا بی بی خورشید طالع مہ لقا آمد''

(ماہ نامہ مخطوطہ سالار جنگ)

سادات بار ہہ سے تعلق رکھنے والے اس اعلیٰ خاندان نے حیات انسانی کی پر پیچ شاہراہ پر بہت نشیب و فراز دیکھے فاقہ تنگدستی اور کسمپرسی نے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، اجداد کی عزت اور سادات کے وقار کو بچانے کے لئے صرف مقام ہی نہیں بلکہ نام تک بدلنا پڑا، بار ہہ سے برہان پور اورنگ آباد اور حیدر آباد کا سفر آزمائشوں اور خاک و خون کا سفر تھا اس آزمائش اور طوائف الملو کی نے ایسی کسوٹی پر پرکھا کہ سفر کی تھکن و ہجرت کے مضمرات تو زائل ہو گئے اور طوائف الملو کی سے ملوکی بھی الگ ہو گیا لیکن طوائف نام کے ساتھ ہی جڑ گیا اور ایسا جز بن گیا کہ چندا کا م اور نام سے زیادہ طوائف سے مشہور ہوئی جبکہ یہ طوائف جسم فروشی کی طوائف نہیں بلکہ طوائف الملو کی کی

طوائف تھی۔ جو علم، ادب، مزاح، مذھب اور ثقافت کے ساتھ ساتھ حسن و جمال میں بھی وہ یکتا و یگانہ تھی جب اسنے نوخیزی کی دہلیز پر قدم رکھا تو اسکا حسن ماہ تمام بن کر دمک اٹھا نظام علی خان آصف جاہ ثانی نے جب اس قتال عالم اور حسن جہاں سوز کا چرچا سنا تو اسکو اپنے دربار میں بلوا کر سکریٹری خصوصی کا عہدہ دیا اس نے اپنی ذہانت و فطانت اور فکر و تدبیر کے بل پر اس قدر قربت حاصل کر لی کہ سفر و حضر میں بھی ساتھ رہتی پانگل کی مہم میں بھی وہ مشیر خاص کی حیثیت سے شامل تھی، اس مہم میں جب فتح حاصل ہوئی تو نظام علی خان نے حیدرآباد میں ایک عظیم الشان جشن منایا اس جشن میں وفاداروں، جاں نثاروں، اور مشیروں کو خطابات سے نوازا گیا اسی جشن میں چندا کو مہ لقا کے خطاب سے نوازا گیا اور او رنوبت و کھڑیال اور ایک ہزار روپئے کے انعام سے بھی سرفراز کیا گیا، مہ نامہ یا تاریخ دل افروز جو غلام حسین خاں جوہر نے اس عہد کی تاریخ کے حوالہ سے لکھی تھی لیکن یہ تاریخ چندا کے گرد گھومتی ہی نظر آتی ہے جس سے چندا کی اہمت و حیثیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، آداب، اطوار، حرکات و سکنات، گفتار و کردار، اور شب و روز کی نشست و برخاست سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نہایت پاکیزہ، عبادت گزار، سنجیدہ اور سخی تھی، بیشتر تذکرہ نگار متفق الآراء ہیں کہ وہ نماز کی پابند تھی فجر کی نماز سے سورج نکلنے تک برابر وظائف اور صحیفۂ حضرت علی امام زین العابدین پڑھنے میں مصروف رہتی ببر علی لاڈلے نامی ایک شخص اسکو قرآن پڑھانے کے لئے آتا تھا علماء کی صحبت میں روضۃ الصفا، حبیب السیر ، اور نادر نامہ جیسی کتابوں کا مطالعہ کرتی اور اس پر مباحث ہوتے اکثر مغرب اور عشاء کی نماز وہ ملا کر ایک ساتھ پڑھتی اسے موسیقی محفل اور مشاعرہ کا بھی شوق تھا، ڈاکٹر د۔ نسیم اورینٹل کالج میگزین ۱۹۶۰ء عدد مسلسل ۱۴۰ کے صفحہ نمبر ۵۰ پر مصنف تاریخ دل افروز کے حوالہ سے چندا کے نظام الاوقات پر ان الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں:۔

''صبح اٹھ کر نماز پڑھتی اور طلوع آفتاب تک داعیہ میں مصروف رہتی پھر قرآن پڑھتی دوپہر کو ظہر کی نماز پڑھکر عصر تک برابر تصبیح و تہلیل میں مشغول رہتی نماز عصر کے بعد دیوان خانہ میں آتی اور گھریلو امور کی طرف توجہ دیتی اس کے بعد اہل علم و سخن جمع ہوتے اور دیر تک علمی ادبی گفتگو ہوتی کتابوں کا بڑا شوق رکھتی تھی اکثر حبیب الصیر اور روضۃ الصفا زیر مطالعہ رہتیں، بعض فارسی اور ریختہ دیوان بھی پڑھتی یہ صحبت نماز مغرب تک چلتی اسکے بعد کھانہ ہوتا نماز عشاء سے فارغ ہونے کے بعد اساتذۂ موسیقی جمع ہوتے اور آدھی رات تک یہ محفل گرم رہتی رمضان میں روزہ کے بجائے روزانہ ۱۲۰ خوان غرباء کو دیا کرتی۔''

چندا نے تہذیب و ثقافت علم نوازی اور معارف پروری کے جس گہوارہ میں آنکھیں کھولیں وہاں بیشتر چیزیں لاشعوری طور اسکی شخصیت میں سرایت کر گئیں جو کسی کو باضابطہ کالج یا ادارہ سے بھی نہیں مل سکتی تھیں، اسی بلند خیالی اور بلند معیاری نے علم و ادب کے ذوق کے ساتھ ساتھ اسمیں بعض مردانہ فنون کا شعور بھی پیدا کر دیا اس نے عنفوان شباب کی دہلیز تک پہنچتے پہنچتے اسپ تازی، نیزہ بازی، تیر اندازی، اور ضرب کاری میں مہارت حاصل کر لی تھی جسکے متعلق درگا پرساد نادر تذکرۂ چمن انداز میں لکھتے ہیں کہ وہ سوار ہو کر اس قدر آسن جماتی تھی کہ اچھے اچھے چابک سواروں کا قافیہ کر دیتی تھی مولوی کریم الدین نے طبقات شعراء میں لکھا ہے کہ وہ مردوں کی مانند ورزش کرتی تھی عبدالغفور نساخ نے تذکرہ سخن شعراء میں لکھا ہے کہ وہ شعراء کی بہت ہی عزت و سرپرستی کرتی تھی عبدالحئی صفاء نے شمیم سخن میں یہاں تک لکھا ہے کہ چندا کے یہاں بہت سے شعراء نوکری کرتے تھے صاحب تذکرہ بہارستان ناز نے یہ عبارت تحریر کی کہ'' چندا ایک امیر عورت تھی اور پانچ سو سوار ہر وقت اس کے جلو میں رہتے تھے'' چندا کی علم نوازی، مسافر پروری، حسن دولت حیثیت اور شمار سیم و زر کے متعلق نصیر الدین ہاشی کاروان سخن ۱۹۵۴ء کے صفحہ ۳۴ پر مہ لقا بائی چندا کے عنوان سے لکھتے ہیں کہ:۔

''چندا کو جس طرح دولت حسن اور دولت سیم و زر نصیب ہوئی تھی اس طرح علم سے بھی بہرہ ور تھی فارسی میں اسکو بہت اچھی مہارت حاصل تھی عربی سے واقف تھی اردو اسکی مادری زبان تھی جسمیں وہ شعر و سخن کی مشق کرتی تھی، ماہ لقا بائی صاحب منصب و جاگیر تھی چنانچہ اڈکمیت (جامعہ عثمانیہ) سید پلی، حیدر گوڑہ، چندا پلے، پلے پھاڑ، اور علی باغ اسکے جاگیری مواضع تھے اسکے مرنے پر صرف نقد و جنس ایک کروڑ روپیہ کا شمار ہوا تھا اسکے ماہوار اخراجات کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ پانچ سو جوان اسکے پہرے کے ملازم تھے ماہ لقا بائی مسافر نواز شاعروں ادیبوں اور اہل کمال کی سرپرست تھی کئی شعراء اور مورخ اس سے وابستہ تھے۔''

ہر طبقہ اور ہر حیثیت کے لوگوں نے چندا کی تعریف و توصیف کی ادیبوں نے مردہ اوراق اسکی شخصیت کے سہارے زندہ کرنے کی کوشش کی تو شعراء نے توصیفی مثنویاں تحریر کر کے اسکی سیرت و صورت کو امر کرنے کی کوشش کی امراء نے سیم و زر سے اسکو خوش رکھنا چاہا تو مورخین نے اپنے قلم کے زور سے اسے لاثانی و لافانی کرنے کی کوشش کی وہ نہ صرف تاریخ کی زینت بنی بلکہ تاریخ اسکے دم سے وجود میں آئیں مہ نامہ جسکی بہترین مثال ہے مورخ گلزار آصفیہ، غلام حسین جوہر صفحہ ۴۲۔۴۴۱ پر شخصیت چندا کا احاطہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

''ہیچ محبوبی بہ این کمالات صوری و معنوی در قرون صابقہ و ازمنۂ ماضیہ در عہد سلاطین گزشتہ در ہیچ تاریخ بملا حظ نرسید و ہیچ نہالی بہ این بار و بہار و ثمر ریزی حسنات در ریاض دھر ندیدہ، تقویم فرمائش آن ماہ اوج کرم فرمائی باعث روشنئ دل و ضیائی دیدہ بود، لاجرم انگشت جنوں بر چشم نہاد، و بہ تعہد تحریر تاریخ دل افروز مرکب قلم را در میدان عجلت جولاں داد۔''

اس عہد کے مشہور شاعر اور چندا کے معاصر شاہ کمال اسکی تعریف میں یوں محو حیرت ہیں:۔

نہ در بے بہا کیونکر کہوں اس مہ لقا کو میں — لبوں کو دیکھکر لعل اسکے ہر دم محو حیرت ہے
ہے سب انداز معشوقانہ اور باتوں میں ہے شوخی — بھری ہر پور پور اسکی ملاحت ہے نزاکت ہے
یہ سج دھج دیکھکر کیونکر نہ ہوئے ہائے دیوانہ — لبوں پر ہے تبسم اور مکھڑے پر شرارت ہے

راجہ چندو لعل بھی چندا کے درشن کے پیاسے رہتے تھے خود انہیں کی زبانی سنئے:۔

نہیں ہے چین بن دیکھے تیرے اے مہ لقا مجھکو — درس کا میں تو پیاسا ہوں درس اپنا دکھا مجھکو

راجہ چندو لعل شاداں کے چھوٹے بھائی گوئند بخش ضیائی نے بھی چندا کی تعریف و توصیف میں اشعار رقم کئے ہیں یہ اشعار مثنوی کے فارم میں بھی ہیں مستزاد کے انداز میں بھی ہیں اور غزلیہ و قصیدہ رنگ کے بھی ہیں توصیف کا ایک انداز آپ بھی ملاحظہ فرمائیے:۔

شہی دارد نہ مثل تو جمالی — رخ تو آفتاب بے زوالی
گل روئے تو رشک گلشن خلد — بہ باغ حسن قدرت نونہالی
کجا ماہ و کجا روئی پری رو — ز گوہر کئی شود ھمسر سفالی
شب ہجراں چو زلفت اے پری رو — مپرس از من چسا دارد کمالی

میر عالم اس عہد میں عالموں کے امیر تھے اہل کمال کے قدرداں تھے علمیت و فضیلت میں یکتا و یگانہ تھے لیکن وہ چندا کے اس قدر معترف و معتقد تھے کہ چندا جیسا انہیں کوئی نظر ہی نہیں آ رہا تھا خود ان کے الفاظ ہی دیکھئے:۔

''جلیس با تمیز و تلمیذی با ایں جدت طبع رسائی مہم مثل مہ لقا کم دیدہ شد''

انہوں نے سراپائے مہ لقا کے عنوان سے دوسوبیس اشعار پر مشتمل ایک رنگین مثنوی بھی تحریر کی جسمیں چندا انہی تمام حرکات و سکنات اور ناز و ادا کے ساتھ جلوہ گر ہے چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

ای ماہ لقا ماہ پیکر ائے ماہ جبیں ماہ منظر
ای حسن تو در جہاں فسانہ دل گرمیٔ عشق را بہانہ
حسن تو ھمین نہ دلربا باشد سر تا پا بہ من بلا باشد
ھرگز نکنم ز تو جدائی ترک رہ و رسم آشنائی
ہجر من تو محال عقلست دور از روش خیال عقلست
من جسمم و جان من تو باشی ھم روح روان من تو باشی

چندا کی زندگی ناز و نعم اور عیش و عشرت میں گزری مذھب، موسیقی، اور مستی سے وہ ھمیشہ قریب رہی جسکی وجہ سے یہی چیزیں اسکی شاعری میں بھی جلوہ گر ہیں اسکی شاعری کا ایک بڑا حصہ حب علی سے لبریز ہے جہاں مذہبی عقیدت تمام چیزوں پر غالب ہے غزل کے بیشتر مقطع حضرت علی کی محبت وعقیدت سے سرشار ہیں:۔

حال دل کسی سے یہ چندا کہے ہر مشکل میں یا علی تیرے سوا کوئی مددگار بھی ہے
مثل بلبل جو اسے دیکھے غزل خواں کیوں نہ ہوں یا علی چندا تیرے گلشن سے پاتی ہے بہار

چندا بہت ہی گمبھیر شخصیت کی مالک تھی اسکی خانگی زندگی اور مجلسی زندگی بالکل مختلف تھی اسکی فیض بخشیاں اہل کمال فقراء و مساکین کے لئے عام تھیں حب علی اور عشق سادات نے اسے خیر خیرات پر مائل کر دیا تھا کہ مولا کے عرس میں وہ مسلسل چار دن خیرات و نوازشات میں مصروف رہتی محرم میں عزاداری اور سوزخوانی میں منہمک رہتی جشن حیدری اور جشن جیلانی کا اہتمام بھی بڑی عقیدت اور محبت سے کرتی اسکے علاوہ کھٹ درشن کا میلہ اسی نوازش بخشش اور خیر خیرات کا وسیلہ تھا جسمیں بلاتمیز وتفریق ہر مذہب وملت کے فقراء و مساکین شامل ہوتے اور اپنی جھولی بھر کر ہی واپس ہوتے:۔

خلق کی ہے کار برآری اسی کی ذات سے کون ہے وہ جو نہیں محتاج سرکار نجف

چندا نے اپنی بیشتر غزلوں میں پانچ شعر ہی کہے ہیں یہ پانچ اشعار پنجتن سے محبت وعقیدت کی علامت ہے حضرت علی کی عقیدت میں ڈوب کر چندا دین ودنیا دونوں میں سرخرو ہونا چاہتی ہے وہ صرف آخرت کی منزل کو ہی سر نہیں کرنا چاہتی بلکہ دنیائے فانی میں رتبہ اور اقتدار کا حربہ چاہتی ہے:۔

ایسی ہوا بندھی رہے چندا کی یا علی با صد بہار دیکھے جہاں کی بہار خوب
یا علی چندا کا ہوئے صفحۂ دنیا پہ نقش جس قدر شاہوں کا قائم ہے نگیں پہ سرخ نام
گنج کرم سے بخشئے مولا کچھ اس قدر چندا کو ہونا پھر کسی زردار کی تلاش
عمر بھر یوں ہی رہے حسن کا چندا جلوہ آرزو رکھتے ہیں یہ حیدر کردار سے ھم

چندا کی شخصیت میں جو جمال وجلال تھا وہ اسکی شاعری میں بدرجۂ اتم موجود ہے اس کشش، جمال، خوبروئی اور بانکپن کا

صرف زمانہ اور اہل علم و ہنر کو ہی احساس نہیں تھا بلکہ چندا کو بھی اسکا نہ صرف احساس تھا بلکہ غرور بھی تھا وہ خود کہتی ہے اسکے سامنے ستارے بھی مات ہیں اور آسمانی برق بھی خائف ہے یہ زمینی مخلوق آسمانی سیاروں اور ستاروں سے زیادہ پر رونق اور پر نور ہے شعر ملاحظہ ہو:۔

روبرو چندا کے ہوئے کیا عجب مشتری و زہرہ و پرویں کو مات
گرمی وہ ہوئے حسن میں چندا کے یا علی جلوے کو اسکے دیکھ کے بس لوٹ جائے برق
روبرو کب ہو لب لعل کے تاب یاقوت نام سن جسکا اتر جائے آب یاقوت

حسن کا شعوری احساس جو اسکی شاعری پہ سایہ فگن ہے وہ اسکی عملی زندگی کا ترجمان بھی فکر کا اساس بھی ہے اور خواب وخیال کا سرچشمہ بھی جہاں حقیقت کا نام حسن اور حسن کا نام حقیقت ہے یہی حقیقت منتظر لباس مزاج میں نظر آئے یہی اسکی تشنگی بھی ہے چندا نے اسی احساس کو کبھی مذہبی انداز میں پیش کیا تو کبھی برجستگی کا لہجہ بھی اختیار کیا اشارہ و کنایہ اور تشبیہ و استعارہ کے لباس عروسی میں ملبوس کر کے مزید خوبصورتی اور اثر انگیزی کے طور پر بھی پیش کرنے کی حتی الامکان کوشش کی تا کہ دل کی کیفیت اور جذبات کی پیاس سے دوسرے بھی آشنا ہو سکیں اور اس درد کا مداوا ہو سکے دلکش انداز ہی اسکی شاعری کی شناخت ہے:۔

غور کیجئے تو ہیں پر نور جمادات و نبات نہ تیرے جلوہ کا ذات بشر میں غوطہ

چندا کی شعری کائنات کو یکجا کر کے منظر عام پر لانے کی کامیاب کوشش بھی ہوئی گوہر، جوہر، ثمینہ شوکت، شفقت رضوی، راحت عزمی، یاسر سندیلوی نے انتہائی محنت و عرق ریزی سے اسے مرتب کیا جبکہ فارسی شاعری کا ایک بڑا ذخیرہ ابھی بھی مخطوطہ کے پیرہن میں ہی ملبوس ہے چندا کے دیوان کے متعلق بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد پاکستان کے شعبۂ اردو کے علمی و ادبی ترجمان مجلّہ معیار کے مدیران معین الدین عقیل اور نجیبہ عارف جولائی تا دسمبر ۲۰۰۹ء کے صفحہ ۳۸۳ پر لکھتے ہیں کہ:۔

''ماہ لقابائی چندا (۱۷۶۵ء-۱۸۲۳ء) اردو کی اولین صاحب دیوان شاعرہ کے طور پر شہرت رکھنے کے ساتھ ساتھ، قدیم اردو (دکنی) ادب کی تاریخ میں اپنی سماجی و تاریخی حیثیت اور مملکت آصفیہ حیدرآباد کے صاحب ذوق اور ادب پرور رئیس ارسطو جاہ کے دربار سے اپنے تعلق و اثر کے لحاظ سے ہمارے محققین کے مطالعات کا موضوع بنتی رہی ہے اور مستقبل میں بھی مزید مطالعات کے امکانات رکھتی ہے، اولاً اس کا ''اردو دیوان'' غلام حسین صمدانی گوہر نے مرتب کیا تھا اور اسکے حالات اور شاعری پر ایک مستقل کتاب ''حیات ماہ لقا'' بھی شائع کی تھی، جب کہ عہد ارسطو جاہ کے ادب اور اس دور کی شخصیات کے مبسوط مطالعات میں بھی اس کا ذکر تفصیل سے شامل رہا ہے لیکن پروفیسر شفقت رضوی نے اس کو اپنے مبسوط مطالعے اور تحقیق کا موضوع ہی نہیں بنایا بلکہ اس کا دیوان بھی اہتمام سے مرتب کیا، جو مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع ہوا۔ ماہ لقا کی تخلیقات میں محض اردو دیوان ہی اہم ہے، جو دو مرتبہ شائع ہوا لیکن یہ اشاعتیں محض دیوان کی اشاعت تک محدود رہیں، جب کہ کتب خانۂ انڈیا آفس (لندن) میں اسکے دیوان کا جو نسخہ مکتوبہ ۱۲۱۳ھ (مطابق ۱۷۹۷ء) محفوظ ہے اس میں اس کا تحریر کردہ ایک مقدمہ بھی شامل ہے جو اس نے رواج زمانہ کے مطابق فارسی میں تحریر کیا تھا۔''

چندا نے اپنے دیوان کا مقدمہ فارسی میں لکھا تھا جو کہ ابھی تک غیر مطبوعہ اس نے اپنے دیوان کا مقدمہ کا آغاز ان الفاظ میں کیا ہے:۔

''فسحت بیانان عالم استغراق در بیانش حمد وثنای آفریدگاری مصداق سبح اللہ ''ما فی الصلوٰت و ما فی الارض'' آنقدر شفوف بیند کہ نفسی بسبق صرف فراموشی برکشتہ مواضح مقالان مدارج افہام بستایش جناب خالقی بعنوانی ''قل لو کان البحر مداداً الکلامات ربی'' آنچنان نپرداختہ

اندکہ چشمی بگزارنحو غفلت کشایند پس خامہ ہارا درمنطول صنائع قدرت نگار معنی لوح وقلم یک سرسر بخونی ہا باید کشیدن و نامہ ہارا در تقریر مختصر عبارت آرای آداب بے نیازی تقدس یکدست بساط توسعہ بہم نچیدن۔ بیت:۔

قلم گر چہ ممدوح ما پسطرون شد		بجمد سخن آفرین سر نگون شد''

اوراپنے دیوان کا اختتام ان فارسی الفاظ میں کرتی ہے:۔

''لیکن چونظر کنی در ینجا سخن است درھمین برسطرش شاہد یست رخ از اغیار نہفتہ   ودرتہہ ہر درفش دلبر یست نقاب اختفاء بر چہرۂ خود کشیدہ۔ بیت۔

حسن ما براز پردۂ شوم بنمایان میشود		معنیم از شوخی الفاظ عریان میشود

واکنون تاریخ انتظام این دلکشا گلستان معروض فہمان میگرداندہ وسال اختتام این فرحت افزا دیوان بعرض اظہار میرساند۔

توقع از دیدہ وران سخن شناس بنظارہ این گلشن معنی پروازندو صدحب قطران دانش اساسش کہ چشم دل برطلعت این مخورہ اذکار کشابزن گر بھوان عمر اقتضای بشری کہ الانسان مرکب اخطا والنسیان واقعست رود ہدو دامن کرم عبث بغبار اغراض نگردد۔ بیت

وان کان من عفو الاحقر مستول		العفو عند کرام الناس مامول۔

والسلام لا۔''

چندا کا انتقال ۱۲۴۰ھ میں ہوا اس وقت اسکی عمر تقریباً ساٹھ سال تھی اسکے لوح مزار پر جو اشعار کندہ ہیں اس سے بھی یہی تاریخ وفات نکلتی ہے۔

ہاتف غیبی ندا دا بتاریخ او		راہی جنت شدہ ماہ لقای دکن (۱۲۴۰ھ)

اور وہ کوہ مولا علی میں سپرد لحد ہوئی میت میں امراء رؤساء ادباء نہ صرف شریک تھے بلکہ پیش پیش بھی تھے اور انہوں نے ہی اسے سپرد خاک بھی کیا، تمکین کاظمی نے لکھا ہے کہ ''ماہ لقا کو امراء اور وزراء نے قبر میں اتارا تھا''، کاظمی کے اس جملہ پر راحت عزمی صاحب اس پر سخت برہم ہیں کہ امراء اور وزراء انہیں کیسے قبر میں اتار سکتے ہیں کیونکہ زنانی میت کو زنانی ہی دفن کرتی ہیں غیر محرم انہیں چھو بھی نہیں سکتے ہیں موصوف کس سماج اور کس شریعت کی بات کر رہے ہیں عقل حیران ہے کیونکہ ھم نے تو آج تک نہیں دیکھا کہ میت کو قبر میں عورتیں لے جاتی ہیں خواہ وہ امراء کی میت ہو یا ادنی کی ہم نے تو سپرد خاک کرتے اور جنازہ پڑھتے ہوئے صرف مردوں کو ہی دیکھا راحت عزمی کس شاہی سماج یا خود ساختہ شریعت کی بات کرتے ہم سمجھنے سے قاصر ہیں خود انہیں کے الفاظ میں سنئیے:۔

''ماہ لقا کی لاش اس کی حویلی سے کوہ مولا علی لائی گئی، وہاں اپنی ماں کی پہلو میں دفن کی گئی، جنازہ کے ساتھ شہر کے امراء بھی تھے، تدفین کے تعلق سے تمکین کاظمی نے عجیب بات لکھی ہے پتہ نہیں انہوں نے ماہ لقا کی عظمت بتائی ہے یا اس کی شخصیت کو بگاڑنے کے لئے مرنے کے بعد بھی اپنے طنز کا نشانہ بنایا انہوں نے لکھا ہے کہ ماہ لقا کی میت کو حیدر آباد کے امراء نے قبر میں اتارا اور یہ اس کے لئے بڑا اعزاز تھا۔ یہ درست نہیں ہے زنانی میت کو نامحرم ہاتھ نہیں لگاتے امرا میت میں ضرور شریک ہوئے ہوں گے کیونکہ وہ تھی ہی ایسی ہر دل عزیز ماہ لقا کی تین سو کنیزیں تھیں حسین افزا اور حسن لقا تو متبنی تھیں اس کی میت کو یقیناً خواتین نے اتارا ہوگا البتہ وہ امراء کی خواتین بھی ہو سکتی ہیں۔''

(بحوالہ ''ماہ لقا حالات زندگی مع دیوان'' مصنف راحت عزمی سنہ ۱۹۹۸ء صفحہ نمبر ۶۸۔۶۹)

مولانا جلال الدین رومی

ڈاکٹر محمد قمر عالم، شعبۂ فارسی،
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

آج سے تقریباً ساڑھے چودہ سو سال قبل جب انسان لاعلمی کی تاریک وادیوں میں بھٹک رہا تھا، اور بظاہر ہر نافع چیز کا پجاری بنا ہوا تھا، حیوانیت اور جہالت مکمل طور پر اس کے ذہنوں پر حاوی تھی لیکن رسول خدا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے وحدت خداوندی کے اسرار و رموز کی وضاحت اور تشریح فرما کر اپنے انداز تعلیم میں مخفی طور پر یہ باور کرا دیا تھا کہ ہر زمانے میں اللہ تبارک تعالیٰ سے لگاؤ رکھنے والی اور مہذب قوم کو کسی نہ کسی نوعیت میں مختصر یا طویل عرصہ کے لئے کسی نہ کسی مقام پر ایک نہ ایک ایسی روحانی شخصیت یا پیشوا کا وجود عمل میں آئے گا، جس کے علم و عمل، طرز زندگی و کردار، اعمال وافکار اور نظریات تمام بنی نوع انسان کے لئے کسی نہ کسی طرح مددگار ثابت ہوتے رہیں گے اور یہ سلسلہ ہمارے نبی کریم ﷺ کے اس دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد سے بھی کسی نہ کسی مقام پر وقتاً فوقتاً روحانی شخصیتوں کا ظہور عمل میں آتا رہا ہے۔ ایسی ہستیوں کی طریقت کی زندگیاں اور انکا طرز عمل وطور طریق بھی منفرد نظر آتا ہے، جیسے کسی نے صوفیانہ انداز سے، کسی نے مخصوص شرعی لحاظ سے، کسی نے فقیرانہ پیرایہ میں، کسی نے وعظ کے توسط سے، تو کسی نے تصنیف وتالیف کے ذریعہ اپنے پیغام کو دنیا میں پھیلا دیا۔

مولانا اپنی ابتدائی عمر سے آخر تک شریعت محمدی پر عمل کرتے رہے اور اخلاق واوصاف نبوی کو اپنی ذات میں ایسا ضم کیا کہ وہ اس کی نظیر بن گئے۔ بے خویشی، انسان دوستی، ادنیٰ ترین مخلوق سے بھی محبت کو اپنا مستقل شیوہ بنایا۔ انہوں نے تمام عمر وحدت یکرنگی کی آنکھوں سے عالم وعالمیان کا مشاہدہ کیا اسی وجہ سے ان کے پیغام کی آفاقیت زمان ومکان کی حدود سے آگے نکل گئی۔

مولانا جلال الدین رومی کا شمار انسان گر شعراء میں سرفہرست ہوتا ہے جنہوں نے ادبیات تعلیمی واخلاقی کے آسمان کو اپنی فکر اور عمل سے پرنور کیا تھا، اور وہ نور ۸۰۰ سال گزرنے کے بعد بھی اسی تابانی کے ساتھ روشن ہے بلکہ روز افزوں اس کی چمک اور نور میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مولانا حقائق ومعارف کے وہ آفتاب تھے جو تمام دنیا پر جلوہ گر ہوا اور ہر کس وناکس کو منور وفیضیاب کیا۔

آئین ھا ہمہ حقیقت جو ہستند وخدای یگانہ را می جویند:۔ خدای تعالیٰ تمام مذاہب سے متعلق ہے کسی ایک خاص مذہب یا دین پر اس کا انحصار نہیں ہے۔ مولانا تمام مذاہب کو متحد اور ہم جہت جانتے ہیں کہتے ہیں کہ ان کے رنگ اور زبان ظاہری ہیں ان کی حقیقت ایک سے زیادہ نہیں جو کہ تمام مذاہب وادیان میں مشترک ہے، مولانا کی نظر میں میں تمام جامدات صرا اور صرف ندای حق کو ہی سنتے ہیں اور اسی سے راز ونیاز کی باتیں کرتے ہیں اور اسی حقیقت کے متلاشی ہیں:۔

آن ندای کامل هر بانگ و نواست — خود ندا آن است و این باقی صداست
ترک و کرد و پارسی گو و عرب — فهم کردن آن ندای گوش و لب
خود چه جای ترك و تاجیك است و زنگ — فهم کرده آن ندا را چوب و سنگ
هر دمی از وی همی آید الست — جوهر و اعراض می گردند هست

گر نمی آید بلی ز ایشان ولی آمدن شان از عدم باشد بلی (مثنوی دفتر اول۔۲۱۱۸)

آج کی مادہ پرستی میں جہاں بھائی بھائی کا دشمن بنا ہوا ہے، لوگ ایک دوسرے سے محبت سے کم لڑائی جھگڑے اور غصہ میں زیادہ ملوث رہتے ہیں انسان کو اپنے غصہ پر قابو رکھنے کا تو بالکل شعور ہی نہیں رہ گیا ہے، جبکہ مذہب اسلام میں غصہ نہ کرنے کی سخت ہدایت کی گئی ہے قرآن کریم میں غصہ کو پی جانا بنی نوع انسان کا سب سے بہترین عمل قرار دیا گیا ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی غصہ پر قابو کرنے والے شخص کو سب سے سمجھدار، عقلمند، اور ہوشیار بتایا ہے۔ کیونکہ غصہ دنیا کے اندر بڑی بڑی تباہیوں اور بربادیوں کا سبب بنیا ہے اگر ہم اپنے اس غصہ کو قابو کر سکیں تو آج کے معاشرے میں آسانی سے امن وسلامتی سے گزر بسر کیا جا سکتا ہے۔ مولانا روم بھی غصہ نہ کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ غصہ کو قابو میں رکھنے کی جگہ جگہ ہدایت فرماتے ہیں:

گفت دشمن را ہمی بینم به چشم روز و شب بروی ندارم ہیچ خشم
خشم ہر شاہاں شه و مارا غلام خشم را من بسته ام زین و لگام
باد خشم و باد شہوت باد آز برد او را کو نبود اہل نماز

زبان از حرف بد نگاہ داشتن:۔

این بان چون سنگ و ہم آتش وش است و آنچه بجهد از زبان چون آتش است
ای زبان ہم گنج بی پایان تویی ای زبان ہم رنج بی درمان تویی
نکته ای کان جست ناگه از زبان ہمچو تیری وان که آن جست از کمان
وا نگردد از ره آن تیر ای پسر بند باید کرد سیلی را ز سر

حلال روزی کھانا:

وہ شخص جو کہ اپنی محنت ومشقت سے حلال روٹی کھاتا ہے تو اسکی دنیا ایک نور سے روشن ومنور رہتی ہے۔ وہ دنیا میں بڑے آرام و اطمینان سے گزر بسر کرتا ہے تمام آفات، بلاؤں مصیبتوں، اور پریشانیوں سے بچا رہتا ہے۔ لقمہ حرام بہ مثل دام است کہ جہل وغفلت زاید:

لقمه ای که نور افزود و کمال آن بود آورده از کسب حلال
چون ز لقمه تو حسد بینی و دام جہل و غفلت اید آن را دام حرام
من مست و تو دیوانه مارا که برد خانه صد بار ترا گفتم کم خور دو سه پیمانه
در شہر یکی کس را ہشیار نمی بینم ہر یك تیر از دیگر شوریده و دیوانه
جانا بخرابات آئی تا لذت جان بینی جان را چه خوشی باشد بی صحبت جانانه
از خانه برون رفتم مستیم به پیش آمد درہر نظرش مضمر صد گلشن و کاشانه
گفتم ز کجائی تو، تسخر ز ده گفتا من نیمیم ز ترکستان نیمیم ز فرغانه
نیمیم ز آب و گل نیمیم ز جان و دل نیمیم لب دریا بینی ہی در دانه
شمس الحق تبریی از فتنه چه پرہیزی اکنون که در افگندی صد فتنه فتانه

آج کی اس دنیا میں لوگوں کے اندر سے محبت ختم ہوتی جارہی ہے۔ لوگ ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کی کوششوں میں لگے رہتے ہیں۔ لوگوں کا دل دکھاتے ہیں، زمین، مال و دولت کو چھیننے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ ان تمام برائیوں کو روکنے کے لئے مولانا کے اس پیغام کو عام کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ ظاہر پرستی اور ریا کاری کو ترک کر کے ہم لوگوں کو انسان سے میل جول بڑھانا چاہئے، دلوں کو خوش کرنا چاہئے، آپسی تعلقات قائم کر کے گلے شکوے دور کر کے اپنے ملک اور دنیا کی ترقی میں ہاتھ بٹانا چاہئے۔ انسان سے میل جول رکھنا، دلوں کو خوش کرنا ہی اصل عبادت ہے، مولانا فرماتے ہیں، اس دنیا میں کوئی شخص چاہے بادشاہ ہو یا گدا، اسیر ہو یا فقیر، جوان ہو یا پیر، اگر پسندیدہ طبیعت کا مالک ہے تو کامیابی اسی کو حاصل ہوتی ہے:

از ہزاران کعبه یك دل بهتر است — دل بدست آور که اکبر است
کعبه بنیاد خلیل آذر است — دل گذر گاه جلیل اکبر است
اختلاف خلق از نام او فتاد — چون به معنی رفت آرام اوفتاد (مولانا)

دنیا کے اندر ہر ملک کی اپنی اپنی زبان بولی جاتی ہے، ہر شخص اپنی اپنی زبان میں، ہر شخص اپنی اپنی زبان میں خدای تعالیٰ کو یاد کرتا ہے، اس کی اطاعت کرتا ہے، سلامتی دیتا ہے، دنیا میں امن وسکون کی خواہش کرتا ہے، سب کے سب اپنی اپنی زبان میں خدا کو پکارتے ہیں، سب کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے صرف اور صرف زبان کا فرق نظر آتا ہے، اگر آج کے اس دور میں ہم بھی زبان کی وجہ سے پیدا ہونے والے اس فرق کو دور کرنے پر غور کریں کہ ہم سب کا مقصد تو ایک ہی خدا کی رضا کی حاصل کر کے سلامتی چاہتا تو اس دنیا سے فساد، جھگڑا، لوٹ مار، قتل و غارت گری دور ہو جائے۔ مولانا روم نے زبان کے اسی فرق کو دور کرنے کے مثنوی معنوی کے دفتر دوم میں ایک دلچسپ واقعہ نظم کیا ہے۔ واقعہ اس طرح ہے کہ چار شخص ہوتے ہیں اور چاروں الگ الگ زبان کو جاننے والے تھے، ایک شخص ان کو ایک دام دیتا ہے کہ آپ لوگ اپنے لئے کوئی چیز خرید لیں، پہلا شخص جو کہ فارسی زبان جانتا تھا بولا: اس روپیہ سے انگور خریدتے ہیں۔ دوسرا عربی زبان میں بولا: انگور نہیں مجھے تو عنب کی خواہش ہے۔ تیسرا شخص رومی زبان میں بولا: ہمیں نہ انگور نہ عنب بلکہ استافیل خریدنا چاہئے۔ آخر میں چوتھا شخص ترکی زبان میں بولا: سب چیز کو چھوڑ دو اوراز وم خرید لو ہم سب اس کو کھالینگے۔ اسی بات کو لیکر چاروں میں جھگڑا شروع ہو جاتا ہے۔ آخر کار وہاں ایک ایسا شخص آجاتا ہے جو چاروں کو جانتا تھا اس نے ان چاروں کو سمجھایا کہ آپ سب ایک ہی چیز کی خواہش کر رہے ہو مگر الفاظ الگ الگ ہیں، مولانا کی اس حکایت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں لوگوں کے درمیان زیادہ تر اختلاف لفظی ہیں:

چار کس را داد مردی یك درم — آن یکی گفتی این به انگوری دهم
آن یکی دیگر عرب به گفت لا — من عنب خواهم نه انگور ای دغا
آن یکی ترکی بدو گفت این بنم — من نمی خواهم عنب خواهم ازم
آن یکی رومی بگفت ہر این قیل را — ترك كن خواهیم استافیل را
در تنازع آن نفر جنگی شدند — که ز سر نام ها غافل بدند
صاحب سری عزیز تا صد زبان — گر بدی آنجا بداوی صلح نشان

مولانا روم اپنے علم و فضل میں یکتای روزگار ہونے کے ساتھ نہایت منکسر المزاج اور متواضع تھے۔ وہ نہ صرف مسلمانوں کے

اپنی ہمدادو عنایت فرماتے تھے بلکہ غیر مسلموں، یہودی، عیسائیوں اور مجوسیوں کے ساتھ بھی انکا یہی برتاؤ تھا۔مناقب العارفین میں ایسے ہی ایک اہم واقعہ درج ہے: ایک مرتبہ استانبول کا ایک بڑا پادری عالم ان کی خدمت میں حاضر ہوا،مولانا کی علمی جلالت و ہیبت شان کو دیکھ کراس پادری پر ایک وارفتگی طاری ہوگئی اور آپ کے سامنے زمین پر سجدہ ریزی شروع کردی جب اس کو ہوش آیا اور حالت کچھ بہتر ہوئی تو اس نے دیکھا کہ مولانا بھی اسکے سامنے اسی طرح زمین پر سر رکھ رہے ہیں، یہ دیکھ کر اس کی حالت میں تبدیلی آگئی اور اس نے کپڑے پھاڑنا، چیخنا چلانا شروع کر دیا اور کہا کہ سلطان السلاطین ایک معمولی پادری کا یہ اعزاز اور آپ کی یہ انکساری و تواضع ،آپ نے فرمایا ہمارے آقا رسول ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ اس بندے پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی انعام ہے جس کو اس نے دولت ،عزت ،شہرت ،حسن ، جمال و طاقت عطا کی اور اس نے اس دولت کو دوسروں پر خرچ کیا،عزت کی حفاظت کی ، اپنی شہرت و نا موای کے باوجود دوسروں کے ساتھ تواضع وانکساری کا رویہ اختیار کیا۔ جب میں ایسے نبی کی امت کا ایک ادنی فرد ہوں تو بندگان خدا کے ساتھ تواضع وانکساری کیوں نہ کروں ، یہ سنکر وہ پادری عالم اور اس کے ہمراہی مشرف بہ اسلام ہو گئے ۔

مولانا نے اپنی شاعری کے ذریعہ اخلاقی مسائل کی تعلیم اور کردار سازی آدمیت کو انسانیت سے ہم کنار کرنے ضروری و اہم نکات کی تفہیم کے طریقے کو اوج کمال پر پہنچا دیا اور ان کے ضمن میں نفس ابسانی کے عیوب پوشیدہ اسرار اپنے لطیف پیرایہ میں پیش کئے کہ موجودہ زمانے کے لئے ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل و تعمیر کے واسطے بیش نعمت نصیحتیں کی ہیں ۔

دنیا و مافیہا:

سب کہتے ہیں کہ دنیا ناپائدار ہے اور دولت دنیا سے زیادہ فانی سب مانتے ہیں مگر سب پائداری کے سامان بناتے ہیں، جس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ کہنے کے لئے دنیا ناپائدار ہے مگر عمل کرنے کے لئے نہیں اس میں ضرور کوئی نکتہ ہے دنیا میں جو پیدا ہوا وہ قسام ازل کی تقسیم کے موافق اپنا حصہ ضرور پائے گا خواہ برا مانے خواہ خوش ہو، اگر یہ خیال دنیا میں ذہن نشین ہو جائے کہ دنیا اور اس کی دولت دونوں ناپائدار ہیں تو ایسے ہر انسان کو فرحت روحانی حاصل ہو جاتی ہے، وہ دنیا کے تمام مصائب اور تکالیف سے نجات پالیتا ہے پس دنیا میں رہ کر اسے فانی سمجھنا معراج کمال ہے۔

دلآزاری:

جہالت کثیر الاولاد ہے، دنیا کے ۳۔۴ حصے پر قابض ہے، دل آزاری بھی اسی اسی نسل سے ہے، روحانیت ان جانداروں کی دشمن ہے، جہاں یہ بڑھی ان کی اولاد گھٹی، پس جہاں روحانیت کا دور ہوگا وہاں جہالت کا خاندان کافور ہوگا۔

صبر و قناعت:

خواہش کہو یا آرزو، مدعا کہو یا تمنا، غرض یہ کہ اس خاندان کے سب افراد انسان کے دشمن مادرزاد ہیں، دشمنوں سے ترک تعلقات ہی حفظ آبرو کا باعث ہوسکتا ہے اس نمک حرام خاندان کو جو منہ لگاتا ہے منہ کی کھاتا ہے، دانشمند بھوکے مرتے ہیں مگر کبھی اس خاندان سے دل نہیں لگاتے ہیں، جو موجود ہے اسی پر صبر کرتے ہیں دست درازی ان کے مذہب میں روا نہیں، اسی عمل کا نام قناعت ہے، یہ دولت ہر ایک کے حصے میں نہیں آتی ہے قانع مزاج ہر حالت میں دنیا کے اندر سکون و عافیت کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے۔

سخاوت:

خیرات وسخاوت ایک ہی بات ہے سخی کی یہ صفت سخاوت کہلاتی ہے، سخاوت کا فیضیاب عطیہ بخشش اور خیرات سے اسے نامزد کرتا ہے۔

عہد حاضر میں دنیا کے اندر ہر طرف پانی کے بچاؤ کے لئے نئے نئے قدم اٹھائے جا رہے ہیں۔ ہر ملک کی حکومت اپنے یہاں پانی کو کم خرچ کرنے اور ضرورت کے وقت ہی استعمال کرنے پر زور دے رہی ہیں چونکہ انسان کی بقاء اور اندگی کا انحصار پانی پر ہی ہے۔ دنیا کے اندر آج بھی بہت سے علاقے پانی سے بالکل محروم ہیں، کچھ جگہوں پر پانی تو ملتا ہے لیکن گدلا اور کثیف جو کہ انسانی صحت کے لئے بہت زیادہ مضر ہے، جہاں پر پانی کی فراوانی ہے، جن علاقوں میں پانی خوب ہے اور آسانی سے دستیاب ہو جاتا ہے ان کو چاہئے کہ پانی کی قدر کریں، بے ضرورت پانی کا استعمال نہ کیا جائے:

آب دریـــا را اگـــر نتــوان کشیــد   ہــم بـقــدر تشـنـگـی بـایـد چشیـد
وقـــت تـــنـگ و مبـــرود آب فــراخ   پیـش از آن کـز ہجر گردی شاخ شاخ
شـہـری کـا ریـزیـست پر آب حیات   آبـکـــش تـــا بـــر دمـد از تـو نبـات
عــقــل تـحـصـیـلـی مـثـال جـویـہـا   کـــان رود از خـــانـــه ای در کـویـہـا
راه آبـــش بستـــه شـد شد بیـنـوا   تشـنــــه مـــانـد و زار و بــا صـد ابتـلا

عشق:

مولانا کے نظام فکر وفن میں عشق اولیت اور مرکزی حیثیت کا حامل ہے، اسلئے کہ عشق راہ کی دشواریوں اور رکاوٹوں کو خاطر میں نہیں لاتا ہے، ان کے یہاں عشق ایک زبردست محرک عمل ہے جو ایک طرف تسخیر فطرت میں انسان کی مدد کرتا ہے اور دوسری طرف اسے کائنات کے ساتھ متحدہ رکھتا ہے، انسان اسی عشق کی بنا پر اتنی بلندی اور قوت حاصل کرتا ہے فقیروں کو بھی خود آ گاہی سکھا کر شہنشاہیت کے اعلیٰ منصب پر فائز کرتا ہے، عشق کو عملی طور پر ایمان کی حرارت اور گرم جوشی ہی سے تعبیر کرنا چاہئے جس کا مقصد حیات کو فعال بنا کر دنیائے انسان میں انقلاب پیدا کرنا ہے، مولانا ظلم وعداوت سے معاشرے کو پاک دیکھنے کے خواستگار تھے وہ دنیا کے گوشے گوشے میں عشق کو بھر دینا چاہتے تھے۔ مولانا مختلف انداز اور مختلف پیرائے بیان میں اپنے اس پیغام محبت کو عام کرتے رہے۔ ان کا کہنا ہے کہ محبت چیزوں کی اصلیت کو بدل دیتی ہے۔

اشعار علامه اقبال لاہوری

از

زبور عجم

چون چراغ لاله سوزم در خیابان شما
ای جوانان عجم جان من و جان شما
غوطه ها زد در ضمیر زندگی اندیشه ام
تا بدست آورده ام افکار پنهان شما
مهر و مه دیدم نگاهم بر تر از پروین گذشت
ریختم طرح حرم در کافرستان شما
تا سنانش تیز تر گردد فرو پیچید مش
شعله ئ آشفته بود اندر بیابان شما
فکر رنگینم کند نذر تهی دستان شرق
پارهٔ لعلی که دارم از بدخشان شما
میرسد مردی که زنجیر غلامان بشکند
دیده ام از روزن دیوار زندان شما
حلقه گرد من زنید ای پیکران آب و گل
آتشی در سینه دارم از نیاکان شما

اقبال کی فارسی تصانیف

سعدالدین، ریسرچ اسکالر، شعبۂ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

اقبال کا تعلق کشمیر کے برہمن کانوادے سے تھا ان کے آباواجداد نے اٹھارویں صدی کے آخیر اور انیسویں صدی کے شروع میں اسلام قبول کیا تھا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اقبال کے آباواجداد کشمیر کو ترک کر کے سیالکوٹ چلے آئے جو اب پاکستان کا ایک شہر ہے۔ ڈاکٹر سر علامہ اقبال ۹ نومبر ۱۸۷۷ میں سیالکوٹ (برطانوی ہندوستان) میں پیدا ہوے۔ انکے والد کا نام شیخ نور محمد تھا۔ اقبال کے آباواجداد جو کہ کشمیری برہمنوں کی نسل سے تھے۔ غازی اورنگ زیب کے عہد میں انہونے اسلام قبول کیا۔ اقبال نے وہیں سیالکوٹ کے کشمیریاں کی مسجد میں حسام الدین سے اپنی ابتدائی تعلیم حاصیل کی۔ اسکے بعد سکاچ مشن اسکول میں داخل ہوے اور ابہت ہی کم عمری سے ہی انہوں نے شروع کیا اور اپنا کلام داغ دہلوی کے پاس اصلاح کہ غرض سے بھیجا انہوں نے کہا کہ یہ اشعار تصیح سے بے نیاز ہیں ۔۱۸۹۵ میں اقبال گورمنٹ کالج لاہور میں لی اور اسی دوران انہوں نے نالہ یتیم بھی لکھا۔ ۱۹۰۵ میں یہ اعلی تعلیم کے لے یورپ گے۔ اور ۳ سال وہاں رہے اور کمبیرج یونیورسیٹی سے فلسفہ کی تحصیل کے بعد وہ سرزمین ہندواپس لوٹ آے ۔ انکی وفات اپریل ۱۹۳۸ ء۔

اقبال بیسویں صدی کے ایک معروف شاعر، مصنف، قانونداں، سیاستداں، مسلم صوفی، اور تحریک پاکستان کی اہم ترین شخصیات میں سے ایک تھے۔ فارسی اور اردو کے بہت بڑے شاعر تھے۔ انکی شہرت کی وجہ فارسی اور اردو شاعری ہے۔ اقبال کو دور جدید کا صوفی سمجھا جاتا ہے اور سیاست میں سب سے نمایا کارنامہ نظریہ پاکستان کی تشکیل ہے جو اقبال نے ۱۹۳۰ء میں الہ آباد میں مسلم لیگ کے ایک اجلاس میں صدارت کرتے ہوئے پیش کیا تھا۔ یہی نظریہ بعد میں پاکستان کے قیام کی بنیاد سمجھی جاتی ہے۔

اقبال کی تدریسی مصروفیات بہت زیادہ تھی لیکن لکھنے پڑھنے کا معمول نہیں کرتے تھے اقبال کی شخصیت کی جو عناصر بنیادی طور پر نظر آتے ہیں ان میں سے زیادہ تر شاہ صاحب کی صحبت اور تعلیم کا کرشمہ ہے۔ جنوبی ایشیا کے فارسی اور اردو بولنے والے لوگوں میں اقبال کو شاعر مشرق کے نام سے جانا جاتا ہے، اقبال حساس دل کے مالک تھے اقبال کی شاعری ایک زندہ شاعری ہے جو برصغیر کے مسلمانوں کے لئے مشغل راہ بنی رہتی ہے۔ اقبال نے نئی نسل میں اپنی شاعری کے ذریعہ انقلابی روح پھونکی اور اسلامی عظمت کو زندہ کیا اقبال کی کئی کتابوں کے انگریزی، جرمنی، فرانسیسی اور دوسری کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔

اقبال فارسی کے سب سے مشہور شاعر مولانا روم کو اپنا روحانی استاد مانتے ہیں اس وجہ سے اقبال کو جنوب ایشیا لوگ پیر رومی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اقبال کو فارسی زبان سے بہت زیادا دلچسپی تھی۔ اس لئے انہوں نے فارسی میں شاعری شروع کی خود انہوں نے ان اشعار میں کہا ہے۔

هندیم ار پارسی بیگانه ام ماه نو باشم نهی پیمانه ام
گرچه هندی درعذوبت شکراست طرز گفتار دری شیرین‌تر است

اقبال کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے وہ اپنے آپ میں ایک بڑی شخصیت ہے اقبال کی شہرت کی سب سے بڑی وجہ

انکی فارسی شاعری ہے اقبال کی تصنیفی کارنامہ کچھ اس طرح سے ہیں:۔
اسرارخودی، رموز بیخودی، پیام مشرق، زبور عجم، جاوید نامہ، پس چہ باید کرد ای اقوام شرق وغیر ہذیل میں ان کے چند مجموعوں کا مختصراً ذکر کرتے ہیں۔

اسرارخودی۔ اقبال کی پہلی فلسفیانہ شاعری کا مجموعہ ہے یہ کتاب ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی اس کتاب میں انفرادی نظمیں شامل ہیں۔اس مجموعے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

نقطۂ نوری کہ نام او خودی است — زیر خاک ماشرار زندگی است
از محبت می شود پائندہ تر — زندہ تر سوزندہ تر تابندہ تر
از محبت اشتعال جوہر اش — ارتقای ممکنات مضمر ش
فطرت او آتش اندوزد ز عشق — عالم افروزی بہ آموزد ز عشق
عشق را از تیغ و خنجر باک نیست — اصل عشق از آب و باد خاک نیست

اقبال کی دوسری فارسی کتاب جو ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی رموز بیخودی ہے، یہ کتاب فرد واحد اور معاشرے کا احاطہ کرتی ہے،اس مجموعے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ای ترا حق خاتم اقوام کرد — بر تو ہر آغاز را انجام کرد
ای مثال انبیاء پاکان تو — ھمگر دلہا جگر چاکان تو
ای نظر بر حسن تر سازادہ ای — ای ز راہ کعبہ دور افتادہ ای
ای فلک مشت غبار کوئی تو — ای تماشا گاہ عالم روی تو
ہم چو موج آتش تہہ پا میروی — تو کجا بہر تماشا میروی

اقبال کی تیسری کتاب پیام مشرق کے نام سے یہ فلسفیانہ شاعری کی ایک تصنیف ہے یہ کتاب دیوان غربی شرقی کا جواب ہے جو مشہور جرمن شاعر گوئٹے کا کلام ہے پیام مشرق ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جہان را ز یک آب و گل آفریدم — تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاک پولاد ناب آفریدم — تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی
تبر آفریدی نہال چمن را — قفس ساختی طایر نغمہ زن را

زبور عجم اقبال کی فارسی شاعری کا چوتھا مجموعہ ہے اس میں مثنوی گلستان راز، جدید اور بندگی نامہ ہے اس کو کتاب کو اقبال نے چار حصوں میں بانٹا ہے دو حصوں میں کلاسیکی غزلیں اور دو حصوں میں نظمیں ہیں یہ کتاب ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی:

صورت نہ پرستم من بتخانہ شکستم من — آن صیل سبک سیرم ہر بند گسستم من
در بود و نبود من اندیشۂ گمانہا داشت — از عشق ہویدا شد ای نکتہ کہ ہستم من
در دیر نیاز من در کعبہ نیاز من — زناز بدوشم من تسبیح بہ دستم من

جاوید نامہ بھی اقبال کی فارسی شاعری کی ایک کتاب ہے یہ کتاب مثنوی کی شکل میں ہے اور دو ہزار اشعار پر مشتمل ہے یہ کتاب ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔ پس چہ باید کرد، اے اقوام شرق اقبال کی فارسی شاعری کا ایک مجموعہ ہے، اس کتاب میں فلسفیانہ شاعری کا مجموعہ موجود ہے یہ کتاب ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔ ارمغان حجاز یہ کتاب اقبال کی وفات کے کچھ مہینہ بعد شائع ہوئی اس کتاب میں اردو و فارسی دونوں زبانوں کا کلام موجود ہے۔ یہ ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔ اقبال نے ۱۹۳۸ء میں بمقام لاہور وفات پائی انہوں نے اپنی وفات سے کچھ روز پہلے یہ اشعار کہے تھے:

سرود رفتہ باز آید کہ ناید — نسیمی از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگار ایں فقیری — دگر دانا راز آید کہ ناید

مختصراً یہ کہ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے معاشرے کی اصلاح، تبلیغ دین اور تعلیمی سوچ کو پھیلانے کی بھرپور کوشش کی ہے، اوران کی یہ کوشش آج کے اس دور میں بھی جاری وساری ہے۔

اظہار تشکر

اردو ادب میں صنف تنقید کی مایہ ناز شخصیت جناب پروفیسر عبدالسلام سندیلوی کا نام کسی تعریف وتعرف کا محتاج نہیں۔ ۵۰ سے زائد تصانیف کے مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ سلام سندیلوی ایک بلند مرتبہ شاعر بھی تھے۔ ان کے ۸ مجموعۂ کلام شائع ہوکر منظر عام پر آ چکے ہیں۔ آپ گورکھپور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے منسلک تھے۔ آپ نے اردو اور فارسی کے علاوہ تاریخ میں بھی ایم اے کی ڈگری حاصل کی تھی، سلام سندیلوی کی حیات میں ہی ۱۹۷۵ء میں سندیلہ میں ایک تنظیم ''بزم سلام سندیلوی'' بنائی گئی۔ جس کے صدر وسرپرست میرے تایا جناب الحاج ڈاکٹر زبیر صدیقی سندیلوی ہیں۔ آپ نے اس بزم کے تحت ماہانہ نشستوں کا انعقاد کرنا شروع کیا تھا۔ جو کہ بعد میں آپ کی مصروفیات کی وجہ سے منقطع بھی ہوا بہرحال ۲۰۱۲ء میں ہمدرد کے بنگلور آفس کے ڈائریکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہونے کے بعد آپ نے اس سلسلے کو تسلسل بخشا۔ پہلے ماہانہ نشستوں کا انعقاد ہر مہینے کیا گیا پھر ۲۰۱۳ء اپریل میں پہلا سالانہ اجلاس اس تنظیم نے منعقد کروایا۔ اور اسی پہلے مشاعرے میں ناچیز (نوید یاسر) کو سکریٹری کا عہدہ تفویض ہوا میں بزم کے تمام ارکان کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے اس قابل سمجھا کہ یہ ذمہ داری دی گئی۔ ۲۰۱۴ء کے ماہ اپریل میں دوسرا سالانہ مشاعرہ منعقد کیا گیا جہاں بزم کے ارکان کی متفقہ رائے سے ناچیز کی تصنیف ''محو کاکوروی'' کا رسم اجراء جناب پروفیسر مشیر حسین صدیقی، صدر شعبۂ عربی کے ہاتھوں ہوا۔ اور اس مشاعرے کے اگلے روز ''پروفیسر سلام سندیلوی شخصیت اور فن'' کے موضوع پر ایک روزہ سیمینار کا انعقاد بھی کیا گیا۔ جس میں اطراف لکھنؤ، کانپور، بارہ بنکی اور ہردوئی کے مقالہ نگاروں نے اپنے اپنے مقالے پیش کئے۔ میں بزم کی طرف سے ان سبھی حضرات کا بھی شکر گزار ہوں۔

علامہ اقبال

مناظر حق، ریسرچ اسکالر، شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

علامہ اقبال بیسویں صدی کے ایک معروف شاعر، مصنف، قانون داں، سیاست داں، مسلم صوفی اور تحریک آزادی کی اہم ترین شخصیات میں سے ایک تھے۔ وہ کشمیری برہمنوں کے ایک قدیم خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ انکے آباء واجداد قبول اسلام کے بعد اٹھارویں صدی کے آخر یا انیسویں صدی کے اوائل میں کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ آے اور محلّہ کھیتاں میں آباد ہوے۔ انکے والد نور محمد کشمیر کے سپرو برہمنوں کی نسل سے تھے۔

علامہ اقبال کی پیدایش سیالکوٹ میں ۱۸۷۷ء میں ہوئی۔ انکی ولادت سے چندروز پہلے ان کے والد نے ایک خواب دیکھا تھا کہ ایک بڑا ہی عجیب وغریب پرندہ فضا میں زمین کے قریب اڑ رہا ہے اور بہت سے لوگ اسے دیکھنے کے لے جمع ہیں۔ لوگوں کے اس ہجوم میں میں بھی موجود ہوں لوگ اس پرندہ کو پکڑنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں لیکن کسی کے ہاتھ نہیں آتا۔ پھر وہ پرندہ خود بخود میرے دامن میں گرا اور میں نے اسے پکڑ لیا، اس کے بعد اقبال کی پیدائش ہوئی تو انہوں نے اس خواب کی یہ تعبیر کی کہ وہ پرندہ یہی بچہ ہے اور یہ بڑا ہو کر ضرور کوئی غیر معمولی شخصیت کا مالک ہوگا۔ اقبال کے والد بہت دیندار انسان تھے۔ ان پر تصوف کا رنگ بہت زیاہ غالب تھا۔ اسلئے اقبال نے ایک صوفیانہ ماحول میں پرورش پائی۔

اقبال کی ابتدائی تعلیم مکتب سے شروع ہوئی اور وہاں انہوں نے قرآن شریف سیکھا۔ دینی تعلیم سے فراغت کے بعد انگریزی اور دیگر علوم کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے سیالکوٹ کے مشن اسکول میں داخلہ لیا۔ چونکہ وہ بچپن سے ہی بہت ذہین وفہیم تھے چنانچہ پانچویں جماعت کا امتحان وظیفہ لے کر پاس کیا۔ اسکے علاوہ ان کو مڈل کے آخری درجہ میں بھی وظیفہ ملا۔ یہاں تک کہ انٹرینس کے امتحان میں بھی سرکاری وظیفہ کے ساتھ کامیابی حاصل کی۔ مولوی میر حسن اسکول میں عربی فارسی پڑھاتے تھے۔ مولوی صاحب کے اقبال کے والد ماجد کے ساتھ بھی بہت گہرے تعلقات تھے۔ مولوی صاحب اقبال کے غیر معمولی استعداد سے بہت متاثر تھے۔ جب وہ چوتھی جماعت میں تعلیم پا رہے تھے، ایک دن اقبال کے والد مولوی صاحب کے پاس تشریف لے گے اور کہا میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ بچے کو آپ اسکول کی تعلیم دینے کے بجاے دینیات کا درس دیا کریں اور آیندہ سے یہ مدرسہ جانے کی بجاے مسجد میں ہی پڑھا کرے، لیکن مولوی صاحب نے مسکرا کر کہا بچہ مسجد میں پڑھنے کے لئے نہیں بلکہ مکتب میں پڑھنے کے لئے پیدا ہوا ہے اور یہ مدرسہ میں ہی پڑھیگا۔ اقبال نے مولوی صاحب کی صحبت سے بہت کسب فیض حاصل کیا، مولوی صاحب بڑی علمی زندگی بسر کرتے تھے۔ اور ان کو شعرائے عرب، شعرائے ایران اور شعرائے اردو کے بے شمار اشعار زبانی یاد تھے۔ جو کوئی بھی ان سے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کر لیتا تھا وہ ان دونوں زبانوں میں عبور حاصل کر لیتا تھا۔ اقبال نے خود مولوی صاحب کی صحبت میں رہ کر اپنے علم میں بہت اضافہ کیا۔ انکی زندگی پر مولوی صاحب کا بہت گہرا اثر تھا اور انکی شخصیت کی مجموعی تشکیل میں جو عناصر بنیادی طور پر کارفرما نظر آتے ہیں ان میں سے بیشتر مولوی صاحب کی صحبت اور تعلیم کا کرشمہ ہے۔ فارسی زبان کے ساتھ۔ساتھ انھوں نے پنجاب کے عربی امتحانات بھی اول درجہ میں پاس کئے۔ چنانچہ وہ مہاراجہ سرکشن بہادر وزیر اعظم ریاست حیدرآباد دکن کو خط میں لکھتے ہیں کہ:

''عربی زبان کے امتحانات میں میں پنجاب میں اول رہا ہوں''

۱۸۹۳ء میں اقبال نے میٹرک اور ۱۸۹۵ء میں انہوں نے ایف اے کا امتحان پاس کیا اور مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے لاہور چلے گے۔ وہاں پہونچ کر گورنمنٹ کالج میں بی۔ اے میں داخلہ لیا اور ہاسٹل میں رہنے لگے۔ اقبال کی سعادت مندی کی وجہ سے مسٹر آرنلڈ جو وہاں فلسفہ کے پروفیسر تھے جو اس سے پہلے علی گڑھ کالج میں بہ حیثیت پروفیسر منتخب تھے، انھوں نے اقبال کی علمی اور فکری زندگی کا ایک حتمی رخ متعین کر دیا۔ اقبال نے بی۔ اے اور ایم۔ اے میں فلسفہ کے مضامین کا انتخاب کیا اور پروفیسر آرنلڈ کی زیر نگرانی اور سرپرستی میں تعلیم وتربیت حاصل کی۔ انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے کا امتحان بہت اچھے نمبروں سے پاس کیا اور انعام کے طور پر انھیں وظیفہ اور طلائی تمغے بھی حاصل ہوے۔ بعد ازآں ایم۔ اے کے امتحان میں وہ پنجاب بھر میں اول آے اور اس صلہ میں ان کو ''نانک بخش مڈل'' ملا۔ پروفیسر آرنلڈ ان میں علمی اور ادبی جوہر کھلا کر ۱۹۰۴ء میں انگلستان واپس چلے گے۔ اقبال کو انکے واپس جانے کا بہت غم اور افسوس ہوا جسکا اظہار انہوں نے ''نالہ فراق'' کے عنوان سے ایک الوداعی نظم میں کیا ہے:

تو کہاں ہے اے کلیم ذروۂ سینائے علم　　تھی تری موج نفس باد نشاط افزائے علم
اب کہاں وہ شوق رہ پیمائی صحرائے علم　　تیرے دم سے تھا ہمارے سر میں بھی سودائے علم

پروفیسر کی شاگردی اور صحبت میں رہ کر اقبال نے جو علمی اور ادبی ذوق اپنے اندر پیدا کیا تھا وہ ابھی نامکمل تھا چنانچہ وہ انگلستان جانا چاہتے تھے لیکن ایم۔ اے مکمل ہونے کے بعد وہ اورئنٹل کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے مقرر ہو گے۔ لیکن فراغت پا کر ۱۹۰۵ء میں انگلستان روانہ ہو گئے اور ۳۳ برس کی عمر میں ۳ سال کے قیام کے بعد اپنے علم میں بے انتہا اضافہ کر کے ۱۹۰۸ء میں وہاں سے واپس آ کر بیرسٹری شروع کی اور ساتھ ہی ساتھ گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے۔

۱۹۲۳ء میں اپنے علم وفضل شاعرانہ قدرت اور شہرت کی بنا پر 'سر' کے خطاب سے نوازا گیا۔ ۱۹۲۶ء میں انہوں نے سیاست کے میدان میں قدم رکھا۔ اپنی قابلیت، محنت اور علم کی بدولت اس میدان میں انہوں نے ایک خاص مقام حاصل کیا۔ ۱۹۳۰ء میں وہ مسلم لیگ کے اجلاس الٰہ آباد کے صدر منتخب ہوے۔ ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس کی شرکت کے لے ممبر کے لے انکا انتخاب ہوا۔

اپنی تمام زندگی قوم ووطن اور ادب کی خدمات کو انجام دیکر ۱۹۳۸ء میں انکا انتقال ہو گیا۔ حیات اقبال میں لکھا ہے کہ آج تک کسی شخص کی وفات پر اتنی زیادہ تاریخیں نہں کہی گی ہیں مثلاً:

چل دیے عرش معلیٰ پر ٹہلنے کے لیے (۱۳۵۷ھ)　　(جمیل)
عزت قوم ہے مردہ اگر اقبال نہں (۱۳۵۷ھ)　　(بشیر النساء بیگم بشیر)
ہے زوال علم وحکمت مرگ سر اقبال کی (۱۳۵۷ھ)　　(مولانا احسن مارہروی)
سال دیگر ہم قرآن مبین۔ گفت حامد لذۃ لاشاربین (۱۳۵۷ھ)

شاعری: علامہ اقبال ایک حساس دل و دماغ کے مالک تھے۔ آپ کی شاعری زندہ شاعری ہے جو ہمیشہ برصغیر کے مسلمان کے لیے مشعل راہ بنی رہے گی۔ یہی وجہ کہ دنیا کے ہر حصہّ میں لوگ کلام اقبال سے استفادہ کرتے ہیں اور فیض حاصل کرتے ہیں اور

مسلمانان برصغیر اسے بڑی عقیدت کے ساتھ زیر مطالعہ رکھتے ہیں اور انکے فلسفہ کو سمجھتے ہیں۔اقبال نے نئی نسل میں انقلابی روح پھوکی اور اسلامی عظمت کو کیا۔ان کے کئی کتب کے انگریزی، جرمنی، فرانسیسی، چینی، جاپانی، اور دوسرے زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔جن سے بیرون ملک بھی لوگ آپکے متعرف ہیں، اقبال کی ابتدائی نظموں میں وطن سے ان کی گہری محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ان سے پہلے قومی اور وطنی نظمیں قوم وملک کے حالات ومصائب کی طویل داستانیں ہوتی تھیں اور انکی ابتدائی نظموں کا بھی یہی انداز ہے۔اقبال کو اپنے وطن اور یہاں کے لوگوں سے بہت محبت کرتے تھے اور انکی نظموں سے قوم کا کا درد صاف نمایاں ہوتا ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

کیا کہوں امت مرحوم کی حالت کیا ہے   جس سے برباد ہوئے ہم وہ مصیبت کیا ہے۔

وطن سے انکی گہری محبت کا جزبہ اس قدر شدید تھا کہ ان کے اولین اردو مجموعہ ''بانگ درا'' کا آغاز ہی ایک ایسی نظم سے ہوتا ہے جو وطن پرستی کے بلند پایہ جزبات سے لبریز ہے۔انہوں نے اپنی وطنی اور قومی نظموں کی بنیاد فخر ودعوی پر رکھی جو دلوں میں جوش وولولہ پیدا کرتی ہے۔'ترانہء ہندی' انکی وہ مشہور نظم ہے جو ایک عرصہ تک ہندوستان کے بچّے۔بچّے کی زبان پر رہا ہے اور آج بھی مقبول ہے، اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا   ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا   وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں   گلشن ہے جس کے دم سے رشک جناں ہمارا
یونان ومصر روما سب مٹ گئے جہاں سے   اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

اقبال کی ایک اور نظم 'ہندوستانی بچّوں کا گیت' ایک ایسی نظم ہے جس کے ایک۔ایک لفظ سے وطن پرستانہ جزبات کا اظہار ہوتا ہے۔وطن کے ساتھ اتنے گہرے لگاؤ کا اظہار کرنے والی اردو میں بہت کم نظم لکھی گئی ہیں۔چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

بندے کلیم جس کے، پربت جہاں کا سینا   نوح نبی کا آکر ٹھہرا جہاں سفینا
رفعت ہے جس زمیں کی بام فلک کا زینا   جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

مختصر یہ کہ اقبال کی قومی اور وطنی نظموں کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وطن کی محبت میں وہ کسی بھی شخص سے پیچھے نہیں تھے اور یہ محبت تمام عمر ان کے لئے متاع عزیز رہی ہے۔ان کی تمام قومی اور وطنی نظمیں اسی جوش وخروش کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں جیسے پہلے پڑھی جاتی تھیں۔

اقبال کا تصور عشق

نشاط فاطمہ
ریسرچ اسکالر، شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

عشق از فریاد ما ہنگامہ ہا تعمیر کرد! ورنہ این بزم خموشاں ہیچ غوگا ندارد

محبت کا بلندتر درجہ عشق کہلاتا ہے عشق کی دو قسمیں ہیں مجازی یا حقیق۔ یہ عشق ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہیاور ہر عشق کے مدارج مختلف ہوتے ہیں کوئی عشق مجازی میں اپنی تمام زندگی وقف کر کے فنا تک پہنچتا ہے تو کوئی عشق حقیقی تک رسائی حاصل کر کے حقیقت آشنا بن جاتا ہے اور بقا اس کے حصے میں آتی ہے۔

اقبال کا تصور عشق کے سلسلہ میں انتہائی پاکیزہ اور مقدس ہے ان کے عشق سے مراد حقیقت انسانی یعنی ایمان ہے ایمان کا پہلا جز حق تعالیٰ کی وحدیت کا اقرار کرنا اور اس پر شدت سے یقین کرنا ہے عشق سے اقبال کی مراد وہ جذبۂ دروں ہے جو کسی خاص مقصد کے لئے پیدا ہوا اور کسی بلند و پاکیزہ شئے کے حصول میں معاون ہو۔ بقول اقبال کائنات کی ساری رونق اسی کے دم سے ہے ورنہ اس سے پہلے دنیا میں خاموشی تھی عشق کی نگاہوں سے انسان کی تقدیریں بدل سکتی ہیں، اقبال نے اپنے مندرجہ ذیل شعر میں نگاہ مرد مومن کو عشق سے ہی تشبیہ دی ہے:

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس زور بازو کا نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

علامہ اقبال کو خودی کا شاعر کہا جاتا ہے کیونکہ ان کا فلسفہ حیات ''خودی'' ہے اور خودی کے ذریعہ ہی انسان زمین و آسمان پر اپنا اعلیٰ مقام حاصل کر سکتا ہے اقبال نے خودی کو عرفان ذات کا مفہوم دیا ہے یعنی اپنے آپ کو پہچاننا خودی ہے۔ اسی خودی کی وجہ سے شاعر مشرق مفکر اسلام غمخوار ملت فلسفی اور مصلح برصغیر ہندو پاک یعنی علامہ اقبال کے کلام کا سکہ ہند و ایران کی ادبی دنیا پر بیٹھا ہوا ہے اور جس کی شہرت روم و عراق سے لیکر فرنگستان تک پہنچ گئی ہے علامہ کا فلسفہ حیات خودی ہے آج ہر زبان سے یہ شعر سنائی دیتا ہے:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اس خودی کی تخلیق عشق کے ہی ذریعہ وجود میں آتی ہے، اقبال نے عشق کے اصل مفہوم کو اپنی شاعری کے ذریعہ منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے یہ وہ عشق نہیں جہاں معشوق اور عاشق کی باتیں ہوں اقبال کے عشق میں لیلیٰ مجنوں، شیریں و فرہاد اور ہیر رانجھا جیسے واقعات و کردار نظر نہیں آتے بلکہ ان کے عشق کے مرکز محور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں جو حق و صداقت اور عزیمت ایمان کا معیار سمجھے جاتے ہیں۔ اقبال کا عشق انہیں پاکباز ہستیوں کی طرح کہیں بدر و حنین میں اللہ کا پیغام دنیا تک پہنچانے کے لئے نبرد آزما نظر آتا ہے اور عرب و عجم میں اسلام کا پرچم بلند کرتا ہے تو کہیں پیغام نبوت کے پاس کے خاطر آتش کے سمندر میں غوطہ لگانے کو تیار ہو جاتا ہے اور یہ وہی عشق ہے کہ بحر آتش گلستان لالہ بن جاتا ہے اور بنا کسی پریشانی ہزیمت کے کامیاب و کامران ہوتا ہے:

صدق خلیل بھی ہے عشق صبر حسین بھی ہے عشق معرکہ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

اقبال کا حقیقی عشق مولانا جلال الدین رومی بلخی کی تعلیمات کے زیر اثر شروع ہوا اسی لئے جا بجا اقبال نے مولانا روم کو اپنا

مرشد کامل تسلیم کیا ہے، اقبال مولانا روم کو اپنا روحانی استاد مانتے ہیں اور انہیں ''پیر رومی'' کے نام سے یاد کرتے ہیں مولانا رومی کے نظریہ میں عشق سے حرکت و آرزو پیدا ہوتی ہے ان کے مطابق اور عشق نے حسن کو صحیح مقام دلایا ہے حسن عشق کا مرہون منت ہے اگر عشق نہ ہو تو حسن کو کوئی نہیں جان سکتا رومی کے مطالعے کے دوران اقبال ان کی تعلیمات سے بہت متاثر ہوئے۔ اور ان کی تعلیمات کو ہی اپنی شاعری کا مرکز و محور بنالیا۔

ختم شد

Tri Monthly

DABEER

Vol. 1, Oct. to Dec. 2014, No.1

Printed Matter

Book Post

To, ______________________________

____

____

____

Pin Code: ____________________

Editor

Ahmad Naved Yasir Azlan Hyder

DABEER HASAN MEMORIAL LIBERARY,

12, CHOUDHARI MOHALLA, KAKORI,

LUCKNOW-227107

Mob: 08791998274

مثنوی نگاری بعہد اورنگ زیب

از

سید محمد اصغر عابدی

قیمت:-۲۵۰ روپے

ملنے کا پتہ

شعبۂ فارسی،

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

لمعات تصوف

از

پروفیسر عمر کمال الدین کاکوروی

قیمت:-۲۵۰ روپے

ملنے کا پتہ

دبیر حسن میموریل لائبریری،

۱۲ چودھری محلّہ، کاکوری، لکھنؤ